حضرتِ انسان
خرّم علی شفیق

حضرتِ انسان

جدید زمانے کی تاریخ اقبال کی نظر سے

خرّم علی شفیق

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

کاپی رائٹ © ۲۰۲۶ء

مصنف اپنے اخلاقی حقوق کا اعادہ کرتا ہے۔

کتاب کے جملہ حقوق بحق الہجرہ سکولز ٹرسٹ محفوظ ہیں۔ اِس کتاب کا کوئی حصہ کاپی رائٹ کے مالک کی پیشگی تحریری اجازت کے بغیر مطبوعہ صورت میں شائع نہیں کیا جاسکتا۔

اِس کتاب کا برقی نسخہ (ڈیجیٹل الیکٹرانک کاپی) بین الاقوامی لائسنس:

Creative Commons Attribution-NoDerivatives 4.0 International (CC BY-ND 4.0)

کے تحت جاری کیا گیا ہے، جس کی رو سے کتاب کو ڈیجیٹل طور پر بلا معاوضہ شیئر کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ مصنف اور ناشر کے نام واضح طور پر برقرار رکھے جائیں، اور متن اور مواد میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا ترمیم نہ کی جائے۔

ISBN: 978-627-7400-05-7

ناشر:

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

Millat College Building
Near Khana Pul, Service Road East
VIP Ghauri Town, Islamabad Expressway
Islamabad, Pakistan
Phone: +92512248915
Email: info@alhijrah.pk

پہلی بار پاکستان میں الہجرہ سکولز ٹرسٹ نے ۲۰۲۶ء میں طبع کروا کے شائع کی۔

فہرس

	پہلی بات	6
باب ۱	ہمیشہ کی زندگی	11
باب ۲	طاقت کے سرچشمے	57
باب ۳	تقدیر کے راز	106
باب ۴	فطرت کی آغوش	174
باب ۵	ستاروں سے آگے	182
باب ۶	اب کیا کرنا چاہیے؟	188
	حوالے	197

پہلی بات

علامہ اقبال یہ سمجھتے تھے کہ وہ آیندہ صدیوں میں پیش آنے والے واقعات سے بھی واقف ہیں۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ اُنھوں نے انسانی تاریخ پر قرآن کی روشنی میں گہرے غور و فکر کے بعد یہ علم حاصل کیا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں اُنھوں نے اِسے حیات مستقبلۂ اسلامیہ کے عنوان سے لکھنا شروع کیا لیکن دس پندرہ برس کی محنت کے بعد اِس کتاب کا عنوان بدل کر اسے دو فارسی تصانیف زبورِ عجم اور جاویدنامہ کی صورت میں شائع کیا۔ ان تصانیف میں روائتی انداز کی پیش گوئیاں نہیں تھیں۔ بلکہ وہ اصول بیان کیے گئے تھے جن کی مدد سے ہم خود قوموں کی تقدیر معلوم کر کے مستقبل کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں:

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں[1]

اُن اصولوں کی روشنی میں قدیم زمانے کی تاریخ سرگزشتِ آدم کے عنوان سے پیش کی جا چکی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانیت سات مراحل سے گزر کر اپنی ترقی میں ایک خاص مقام تک پہنچی اور ہر مرحلے پر پیغمبروں نے انسانیت کی رہنمائی کی۔ یہ مراحل آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکمل ہوئے جب مزید وحی کی ضرورت باقی نہ رہی۔

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۵۹

لٰہذا اُس مقام سے انسانی تاریخ کے جدید زمانے کا آغاز ہوتا ہے۔ اِس کے ہر دَور میں انسانیت خدا کے تصوّر کے کسی ایک مخصوص پہلو کو اپنے تجربے میں لانے کی کوشش کر رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک ایسے سماجی، فکری یا تکنیکی ماحول کی تشکیل جہاں ایک عام انسان بھی خدا کے تصوّر کے اُس مخصوص پہلو کو محدود پیمانے پر لیکن اخلاقی معنویت کے ساتھ محسوس کر سکے۔ خدا کے تصوّر کے یہ پانچ پہلو جنہیں انسانی تاریخ بتدریج محسوس کرنے کی کوشش کر رہی ہے، اقبال کے لحاظ سے مندرجہ ذیل ہیں:

۱ خدا ہمیشہ رہنے والا ہے

۲ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے

۳ خدا سب کچھ جانتا ہے

۴ خدا تخلیق کرتا ہے

۵ خدا کی ذات لامحدود ہے

اِس طرح ہم جدید زمانے کی تاریخ کو پانچ بڑے ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں:

عرصہ	تصوّرِ خدا کا پہلو
۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء	خدا ہمیشہ رہنے والا ہے
۱۲۵۸ء سے ۱۷۴۷ء	خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے
۱۷۴۷ء سے تاحال	خدا سب کچھ جانتا ہے
نامعلوم مستقبل	خدا تخلیق کرتا ہے
نامعلوم مستقبل	خدا کی ذات لامحدود ہے

اِس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے، اُس میں اِن پانچوں ادوار کی ایک مختصر تاریخ

پیش کی جارہی ہے جس سے یہ بات آپ پر پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

مثلاً آپ دیکھیں گے کہ یہاں ہم نے جسے پہلا دَور قرار دیا ہے (یعنی ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء)، اُس عرصے میں انسانیت نے مجموعی طور پر اپنے فانی ہونے کی حقیقت کو پوری شدّت کے ساتھ اور کئی مختلف انداز میں محسوس کیا۔ حکمرانوں نے محسوس کیا کہ محض نئے ممالک فتح کرنے سے سلطنت پائیدار نہیں ہو جاتی۔ چنانچہ اِس کتاب کے پہلے باب ''ہمیشہ کی زندگی''میں، جو اِس دَور کی کہانی پر مبنی ہے، آپ بہت سی مثالیں دیکھیں گے کہ بغداد کی عباسی حکومت اور یورپ کے عظیم شہنشاہ شارلمین سمیت دنیا کے کئی بڑے بڑے حکمران اپنی سرحدیں بڑھانے کے بجائے داخلی استحکام پر توجہ دے رہے ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ اُس زمانے میں دنیا کی بڑی بڑی تہذیبیں انسانی یادداشت کو محفوظ کرنے پر توجہ دے رہی ہیں۔ قدیم علوم پر مبنی کتابوں کو ترجمہ کرنے، دیرپا اداروں کی بنیاد رکھنے اور تصوف کے ذریعے اپنی روح میں جھانکنے کی کوششوں کے ذریعے انسان ایسی زمینی جنت تعمیر کرنے کی کوشش میں مصروف دکھائی دے گا جو فنا نہ ہو۔ فنا کے اِسی گہرے شعور کے ذریعے اور شاہی محلّات کو ایک عارضی سرائے سمجھ کر اِنسانی روح خدا کے ہمیشہ رہنے کے وصف کو تجربے کے ساتھ محسوس کرتی دکھائی دیتی ہے، یہ جانتے ہوئے کہ مادّی قوتیں سب مٹ جاتی ہیں، صرف روح اور سچائی باقی رہ جاتی ہے۔

دُوسرے دَور (یعنی ۱۲۵۸ء سے ۱۷۴۷ء کے عرصے) میں، جس کی کہانی دُوسرے باب ''طاقت کے سرچشمے''میں بیان ہوئی ہے، آپ دیکھیں گے کہ بغداد جیسے مراکز کی تباہی سے تہذیبیں یہ سبق سیکھ رہی ہیں کہ استحکام اور تہذیب، قوّت کے بغیر بے بس ہیں۔ چنانچہ تہذیبوں کی توجہ صرف اپنے تحفظ سے ہٹ کر استعداد اور قوّت پیدا کرنے پر مرکوز ہوتی دکھائی دے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ قبلائی خان اور بعد کے مطلق العنان

بادشاہوں نے صرف ملک فتح نہیں کیے بلکہ اُنہوں نے قوت کا ایک ''جال'' ایجاد کیا: مرکزیت پر قائم ایک وسیع انتظامی نظام جس میں فرمانروا کا حکم ایک ہی دن میں ہزاروں میل دُور تک پہنچ سکتا تھا۔ ہر فرد اُس جال میں ایک دھاگے کی طرح تھا جو مرکز سے اٹھنے والی ہر لرزش کو اپنے آپ میں محسوس کر سکتا تھا۔ یہ دنیا کے اکثر خطوں میں ایسے بادشاہوں اور شہنشاہوں کا زمانہ تھا جن کے پاس ماضی کے حکمرانوں سے کہیں زیادہ طاقت تھی، جیسے مغل، صفوی، عثمانی اور بہت سے دُوسرے۔ اِس طرح انسان نے قدرتِ مطلقہ کے تصوّر کا ایک ہیبت انگیز عملی سبق سیکھا۔ اُسے یہ تجربہ ہُوا کہ ایک واحد ارادہ کس طرح لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔

اب اگر ہم موجودہ زمانے پر آئیں، جس کا آغاز ۱۷۴۷ء سے ہُوا ہے، تو اِس دَور میں انسانیت نے محض قوّت کی پرستش سے آگے بڑھ کر آفاقی قانون اور علم کی جستجو کو اپنا شعار بنایا ہے۔ چنانچہ کتاب کے تیسرے باب ''تقدیر کے راز'' میں، جو اِس زمانے کی کہانی ہے، آپ دیکھیں گے کہ کس طرح عہدِ روشن خیالی، یعنی فروغِ نور (Enlightenment) کی تحریک کے ساتھ انسان اِس حقیقت تک پہنچا کہ کائنات اور انسانی تقدیر بھی کسی ظاہری طاقت کے بجائے قدرت کے قوانین کے تابع ہے جنہیں دریافت بھی کیا جا سکتا ہے اور اُن سے کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ فطرت کے قوانین کو سائنسی ایجادات کے ذریعے اپنے کام میں لا کر اور جمہوریت کے ذریعے ''اجتماعی ارادے'' کو دریافت کر کے انسان نے اپنی تقدیر کو جاننے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اور پھر ٹیلی گرام سے لے کر انٹرنیٹ تک ایک عالمی ''عصبی نظام'' وجود میں آیا، جس نے وقت اور فاصلے کی رکاوٹوں کو عملاً ختم کر دیا۔ آج یہ صلاحیت پیدا ہو چکی ہے کہ انسان خود اِس قابل ہے کہ دنیا کے کسی بھی گوشے سے لمحوں میں دیکھ سکے، سن سکے اور معلومات حاصل کر سکے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہے جس کی مدد سے

وہ اِس بات کو عملاً سمجھ سکتا ہے کہ ”خدا سب کچھ جانتا ہے“ یعنی انسان اگر ایک مخلوق ہو کر بیک وقت پوری دنیا کے حالات سے باخبر ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے تو خدا جو خالقِ کائنات ہے، وہ انسان کے مقابلے میں ایک لامحدود پیمانے پر سب کچھ جاننے کی صفت رکھتا ہے۔

فی الحال ہم اِسی تیسرے دَور میں زندہ ہیں۔ اِس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ دَور کب ختم ہو گا لیکن ہم یہ ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ اگلا دَور جب کبھی شروع ہُوا اُس میں دنیا کے حالات اچانک بدل جائیں گے تا کہ ہمیں خدا کے خالق ہونے کی صفت کا ایک انوکھا تجربہ کروا سکیں۔ اُس آنے والے دَور کے بارے میں کچھ اندازے جو ہم موجودہ علم کی روشنی میں لگا سکتے ہیں، اِس کتاب کے چوتھے باب ”فطرت کی آغوش“ میں پیش کیے گئے ہیں۔

اِسی طرح کتاب کا پانچواں باب ”ستاروں سے آگے“ جدید تاریخ کے ممکنہ پانچویں دَور کے بارے میں کچھ اندازے پیش کرتا ہے کہ وہ کس قسم کے حالات ہو سکتے ہیں جو خدا کے لامحدود ہونے کا عملی تجربہ ہمیں کسی چھوٹے سے پیمانے پر کروا سکیں۔

اب آپ دیکھ سکتے ہیں کہ تاریخ کو اِس نظر سے دیکھنے میں کیا فائدہ ہے۔ آج دنیا کو جو مسائل درپیش ہیں اگر ہم اُن سے نمٹنے کے لیے کوئی تدبیر سوچنا چاہیں تو تاریخ کے اِس نئے علم کی وجہ سے ہم صرف ماضی ہی کو نہیں بلکہ مستقبل کو بھی سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ دُوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اِس طرح ہماری تدبیر صرف تدبیر ہی نہیں رہے گی بلکہ اُس میں دنیا کی تقدیر بھی ہمارے پیشِ نظر ہو گی۔ اِس لحاظ سے آج ہمارے سنگین ترین مسائل کیا ہیں اور اُنہیں کس طرح حل کیا جا سکتا ہے؟ اِس کے لیے کچھ تجاویز اِس کتاب کے آخری باب ”اب کیا کرنا چاہیے؟“ میں پیش کی جا رہی ہیں۔

*

حضرتِ انسان کتابوں کے ایک سلسلے کی کڑی ہے جس کی تفصیل گزشتہ کتاب سرگزشتِ آدم کی "پہلی بات" میں پیش کی جا چکی ہے۔ مختصر طور پر دوبارہ عرض ہے کہ کتابوں کے اِس سلسلے کا مقصد تمام انسانی علوم کو اقبال کے بنائے ہوئے خاکے کے مطابق از سرِ نَو مرتب کرنا ہے۔ ہم اِسے "اقبال سائنسز" بھی کہہ سکتے ہیں۔

اگرچہ کوشش کی گئی ہے کہ یہ کتاب آپ کو دلچسپ معلوم ہو لیکن بہرحال یہ تاریخ کی کتاب ہے اِس لیے ہو سکتا ہے کہ بعض مقامات اور شخصیات کے نام آپ کے لیے غیر مانوس ہوں۔ اِس لیے یہاں وہ تجویز دہرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو سرگزشتِ آدم میں بھی پیش کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کتاب بار بار پڑھنے کے لیے ہے اِس لیے کوئی حرج نہ ہو گا اگر آپ اِسے کئی مختلف انداز میں پڑھ کر دیکھیں، مثلاً پہلی دفعہ صرف وہ حصے پڑھ جائیے جو آپ کو دلچسپ معلوم ہوں اور بعد میں پوری کتاب شروع سے آخر تک بھی پڑھ لیجیے!

سرگزشتِ آدم کی طرح یہاں بھی حوالے صرف اقبال کے براہِ راست اقتباسات کے لیے دیے گئے ہیں کیونکہ اِس کتاب کا بنیادی دعویٰ اقبال کے زاویۂ فکر سے ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ ویسے بھی اِس قسم کی عالمی تواریخ میں تفصیلی حوالہ جات کا رواج نہیں ہے کیونکہ ہر سطر کے لیے الگ ماخذ درکار ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے متن ناقابلِ برداشت حد تک بوجھل ہو جائے اور قاری کو کوئی خاص فائدہ بھی نہ پہنچے۔ موجودہ دور میں، جب آپ انٹرنیٹ اور مصنوعی ذہانت جیسے ذرائع سے خود بھی تاریخی حقائق کی تصدیق بآسانی کر سکتے ہیں، میں آپ کی حوصلہ افزائی کروں گا کہ ایسا ضرور کریں۔

اِملا کے حوالے سے گزارش ہے کہ جن الفاظ کے ایک سے زیادہ اِملا رائج ہیں اُن کے معاملے میں زیادہ آسان اِملا کو ترجیح دی گئی ہے بشرطیکہ وہ لسانیات کے اصولوں کے خلاف

نہ ہو۔ البتہ اشعار نقل کرتے ہوئے اصل اِملا برقرار رکھی گئی ہے۔

اُمید ہے کہ کتاب پسند آئے گی۔ اگر ہو سکے تو اِس کے بارے میں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

اِس سیریز کی دُوسری کتابوں کی طرح اِس کتاب کی پیشکش کے لیے بھی مَیں الہجرہ سکولز ٹرسٹ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہُوں، جس کا مقصد اعلیٰ تعلیم فراہم کر کے اسلام کے معاشرتی انصاف کے اصولوں پر مبنی معاشرے کے قیام کی راہ ہموار کرنا ہے۔ بالخصوص اِس ادارے کے بانی عبدالکریم ثاقب صاحب کی حوصلہ افزائی اور اِدارے کے تحت چلنے والے اسکول کے سابق طالبِ علم اسرار احمد کی معاونت کے لیے مَیں اُن کا شکر گزار ہُوں، جس کی تفصیل اِس سیریز کی کتاب، زندگی کی کتاب، کے دیباچے میں بیان کر چکا ہُوں۔

یہ کتاب جُون ۲۰۲۵ء میں مکمل ہو گئی تھی اِس لیے سیریز کی بعض دُوسری کتابوں کی طرح اِس میں بھی ۲۰۲۶ء کا تذکرہ مستقبل کے صیغے میں کیا گیا ہے۔ میں نے اُسے تبدیل نہیں کیا تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ "اقبال سائنسز" کی روشنی میں مستقبل کے بارے میں لگائے جانے والے اندازے کس حد تک درست نکلتے ہیں۔

خرّم علی شفیق

۷/اپریل ۲۰۲۶ء

باب ۱

ہمیشہ کی زندگی

جہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی
کوئی شے چھُپ نہیں سکتی کہ یہ عالَم ہے نُورانی[1]

*

۷۵۱ء کے قریب چین کے تانگ شہنشاہ کے دربار میں سیاہ لباس پہنے ہوئے عرب سفیر آئے۔ اُنہوں نے بتایا کہ عرب سلطنت پر اُموی خاندان کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ اُنہیں نئے خلیفہ نے بھیجا ہے کیونکہ وہ چین کے ساتھ دوستانہ تعلقات چاہتا ہے۔

نیا خلیفہ آنحضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد میں سے تھا اِس لیے اُس کے خاندان کو بنوعباس یا عباسی خاندان کہا جاتا ہے۔ ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء تک اِس خاندان کے سینتیس خلفائے نے حکومت کی، جن میں سے پہلے دس بڑے طاقتور حکمران تھے۔[2]

---

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۷۹

[2] ان کے نام اور دورِ حکومت یہ ہیں: ابوالعباس سفاح (۷۵۰ء سے ۷۵۴ء)، منصور (۷۵۴ء سے ۷۷۵ء)، مہدی (۷۷۵ء سے ۷۸۵ء)، ہادی (۷۸۵ء سے ۷۸۶ء)، ہارون الرشید (۷۸۶ء سے ۸۰۹ء)، امین (۸۰۹ء سے ۸۱۳ء)، مامون (۸۱۳ء سے ۸۴۲ء)، معتصم (۸۳۳ء سے ۸۴۲ء)، واثق (۸۴۲ء سے ۸۴۷ء) اور متوکّل (۸۴۷ء سے ۸۶۱ء)۔

عباسیوں کا سب سے حیرت انگیز کارنامہ ۷۶۲ء میں دریائے دجلہ کے کنارے ایک نئے شہر کی تعمیر تھا۔ یہ شہر ایک گول دائرے کی صورت میں تھا، جس کا قُطر (ایک کنارے سے دُوسرے تک فاصلہ) دو ڈھائی کلو میٹر تھا۔ دائرے کے مرکز میں خلیفہ کا محل اور جامع مسجد تھے۔ باقی شہر میں صاف ستھری سڑکوں، نہروں، عمارتوں اور باغات کے سلسلے پھیلے ہُوئے تھے۔ پورے شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تھی۔

عباسیوں نے اِسے دارُ السلام یعنی امن کے شہر کا نام دیا اور واقعی یہاں مسلمان، عیسائی، یہودی، پارسی، ہندو، بدھ اور دُوسرے مذاہب کے لوگ آزادی کے ساتھ رہ سکتے تھے۔ دریا کے ذریعے دور دراز کے ممالک کے ساتھ تجارت ہوتی تھی۔ دنیا بھر کے علوم کی کتابیں یہاں لا کر ترجمہ کی جاتی تھیں جن میں قدیم یونان اور روم کی وہ کتابیں بھی شامل تھیں جن پر خود یورپ میں مسیحی اثرات کی وجہ سے پابندی لگ چکی تھی۔ دُور دراز کے ملکوں میں لوگ اِس شہر کے تذکرے یوں سنتے جیسے یہ کوئی خوابوں کا شہر ہو۔ وہ اِسے اِس کے علاقائی نام سے یاد رکھتے تھے اور وہ نام ہے بغداد!

بغداد کو صحیح عروج پانچویں اور ساتویں عباسی خلیفہ، ہارون الرشید (حکمرانی ۷۸۶ء سے ۸۰۹ء) اور اُس کے بیٹے مامون (حکمرانی ۸۱۳ء سے ۸۴۲ء)، کے زمانے میں حاصل ہُوا۔ اگرچہ دنیا کے اکثر بادشاہوں کی طرح اِن کے دامن پر بھی بعض مظالم کے دھبے تھے لیکن پھر بھی اُس زمانے میں اسلامی تہذیب جوانی کی ترنگ میں تھی۔ خلیفہ نہ صرف فقہ اور حدیث کے ماہر ہوتے تھے بلکہ دنیاوی علوم اور فنون میں بھی کسی پرجوش طالب علم کی طرح دلچسپی لیتے تھے۔ عالموں، شاعروں اور موسیقاروں کی محفلیں منعقد کرتے تھے اور کبھی کبھار خود بھی شاعری کر لیتے تھے۔ اِس ماحول نے ذہنوں پر جو اثرات مرتب کیے اُنہوں نے بعد میں الف لیلہ کی کہانیوں کو جنم دیا جو آج تک مشہور ہیں۔

*

اُس زمانے کی ایک عجیب و غریب شخصیت ابوالحسن زِریاب (وفات اندازاً ۸۵۷) ہے۔ بغداد میں موسیقی محض عیاشی کا ذریعہ نہ رہی تھی بلکہ ایک علم اور فن کی حیثیت رکھتی تھی جسے فلسفے اور ریاضی کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ زِریاب بھی بغداد کا ایک صاحبِ علم موسیقار تھا جو کسی وجہ سے ہجرت کر کے اندلس چلا گیا۔ قرطبہ کے اُموی حکمرانوں نے اُس کی بہت قدر کی جن کی بدولت زِریاب نے عربی اور ایرانی موسیقی کو ایسی ترقی دی کہ اُس کے اثرات مسلمانوں تک محدود نہ رہے۔ ہسپانیہ کے مسیحیوں کے ذریعے یہ دنیا بھر میں پھیلے۔ چنانچہ اسپینش گیٹار(Spanish guitar) جیسے سازوں اور فلیمنکو (Flamenco) جیسے رقص سے لے کر موسیقی کے اُس مخصوص انداز تک جسے دنیا آج اسپین اور جنوبی امریکہ کے حوالے سے پہچانتی ہے، اور دنیا بھر میں کلاسیکی اور پوپ موسیقی میں یکساں سنائی دیتا ہے، سب اندلس کی اسلامی ثقافت کا ورثہ ہیں جس کی بنیاد زِریاب نے ڈالی تھی:

بُوئے یمن آج بھی اُس کی ہَواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اُس کی نواؤں میں ہے[1]

استحکام کی تلاش

عباسیوں سے پہلے عرب سلطنت تین براعظموں پر پھیل چکی تھی اور اِنسانی تاریخ کی کسی پچھلی سلطنت سے زیادہ وسیع تھی۔ عباسیوں نے اگرچہ اُموی خاندان کے تقریباً ہر فرد کو

[1] اقبال، 'مسجدِ قرطبہ'، بالِ جبریل، ص ۱۳۴

قتل کر دیا تھا لیکن پھر بھی ہسپانیہ (موجودہ اسپین اور پرتگال) اُن کے ہاتھ نہ آسکا کیونکہ ایک اموی شہزادہ عبدالرحمٰن، جسے عبدالرحمٰن الداخل بھی کہا جاتا ہے، شام سے فرار ہو کر ہسپانیہ پہنچنے میں کامیاب ہُوا اور وہاں اپنے خاندان کی حکومت میں ایک نئی تہذیب کی رُوح پھونک دی:

صبحِ غربت میں اور چمکا ٹُوٹا ہُوا شام کا ستارہ

موجودہ مراکش، الجیریا، تیونس اور عمان کے علاقے بھی عباسیوں کے قبضے میں نہ آئے یا جلد ہی ہاتھ سے نکل گئے، اور وہاں مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ عباسیوں نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں۔ مغرب میں اُن کی فوجیں روم کے قریب جا پہنچیں۔ مشرق میں گلگت بلتستان اور کشمیر پر بھی اُنہوں نے حملے کیے۔ لیکن ان میں سے بہت کم ہی علاقے اُنہوں نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُموی حکمرانوں کے برعکس عباسیوں کی اصل توجہ سلطنت کو وسیع کرنے کی طرف نہیں بلکہ اُسے اندرونی طور پر مستحکم اور خوشحال بنانے پر تھی۔ چونکہ اُنہوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے پچھلی حکومت کے خلاف جگہ جگہ بغاوتیں کروائی تھیں، اِس لیے باغیانہ رجحانات بعد میں بھی جاری رہے۔ خود عباسیوں کو بیشمار بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے سلطنت کو دوبارہ استحکام دینے کے لیے مقامی شخصیات اور رسوم و رواج کے احترام کی پالیسی اپنائی۔ ایرانیوں نے تو اُنہیں حکومت دلوانے میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا اِس لیے عباسیوں نے قدیم ایران کے بہت سے سیاسی اداروں اور رسوم و رواج کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ اُن کا نظامِ حکومت عملاً سائرس اعظم کے ایجاد کیے ہوئے نظامِ حکومت کا ایک اسلامی رُوپ تھا۔

*

دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں دنیا کی اکثر تہذیبوں میں یہی رجحان دکھائی دیتا ہے کہ جگہ جگہ بغاوتیں سر اُٹھاتی ہیں لیکن ہر جگہ کوئی مرکزی طاقت اُنہیں دباتے ہوئے ملک کے اندرونی طور پر استحکام کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ اور اِس مقصد کے لیے بہت سے سیاسی رجحانات کے امتزاج سے کام لیا جاتا ہے۔

اسلامی سلطنت کے علاوہ رومی سلطنت، یورپ، چین، ہندوستان، جاپان اور یہاں تک امریکہ کے براعظموں میں بھی اِس کی مثالیں دیکھی جا سکتی تھیں (اگرچہ ان میں سے بعض علاقوں کے آپس میں رابطے بھی نہیں تھے اور امریکی براعظموں کے وجود سے تو باقی دنیا واقف ہی نہ تھی)۔ مثلاً رومی سلطنت نے، جو حقیقت میں مشرقی رومی سلطنت پر مشتمل تھی اور بعد میں بازنطینی کہلائی، اپنے کھوئے ہوئے مقبوضہ جات کو عربوں سے واپس لینے کی کوشش ترک کر کے اپنے باقی ماندہ حصوں یعنی موجودہ ترکی کے بعض حصوں اور مشرقی یورپ کے بلقان خطے (یونان، بلغاریہ، بوسنیا، سربیا، رومانیہ اور بعض دوسرے علاقوں) کو مستحکم کرنے پر توجہ مرکوز کر دی۔ یورپ مغربی حصوں میں ۷۵۱ء میں کارولنگی (Carolingian) خاندان کی حکومت قائم ہوئی، جس کے مشہور ترین بادشاہ شارلمین (Charlemagne) کا دَورِ حکومت ۷۶۸ء سے ۸۱۴ء تک ہے۔ اُسے بھی اندرونی بغاتوں کا سامنا کرنا پڑا اور جس طرح عباسیوں نے ایرانی سیاسی ادارے اپنائے تھے، اُسی طرح شارلمین نے اپنی یورپی سلطنت کے استحکام کے لیے علاقائی حکمرانوں سے کام لیا، جنہیں کاؤنٹ کہا جاتا تھا۔

مشرق کی طرف چین میں بھی ۷۵۵ء سے ۷۶۳ء تک ایک زبردست بغاوت ہوئی جس کے بعد تانگ (Tang) خاندان کے شہنشاہوں نے مقامی طاقتوں کو ساتھ ملا کر ملک

کو استحکام دینے کی کوشش کی۔ برصغیر کے مختلف حصوں میں جو حکومتیں قائم ہوئی اُنہوں نے بھی فتوحات کے ذریعے اپنی سرحدیں پھیلانے کے بجائے داخلی استحکام پر زیادہ توجہ دی۔ مثلاً پالہ خاندان نے ۷۵۰ء سے ۱۱۷۴ء تک بنگال اور بہار، پرتیہارا خاندان نے ۷۳۰ء سے ۱۰۳۶ء تک شمالی ہندوستان اور راشٹر اکوٹہ نے ۷۵۳ء سے ۹۸۲ء تک دکن پر حکومت کی۔ لیکن ان سب نے سرحدیں وسیع کرنے کے بجائے اپنے اپنے علاقوں کو استحکام دینے کی کوشش کی۔ جاپانی تاریخ میں ۷۹۴ء سے وہ زمانہ شروع ہُوا جسے ہائیان (Heian) دَور کہا جاتا ہے، جب شہنشاہ نے درباری رسومات اور انتظامی بندوبست کے ذریعے حکومت کو استحکام دیا، اور جاپانی ثقافت نے عروج حاصل کیا۔ امریکی براعظموں میں مایا تہذیب کے عروج کا زمانہ ڈھل رہا تھا، اور شہری ریاستیں اپنے آپ کو مستحکم کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔

*

اُس زمانے کے اکثر بادشاہوں نے اپنے اقتدار کا جواز فراہم کرنے کے لیے مذہبی دلائل کو بنیاد بنایا۔

جاپان میں شہنشاہ کو سورج دیوی کی اولاد سمجھنا ریاست کی آئیڈیالوجی کا حصہ بنا۔ ہندوستان میں شاہی خاندانوں نے مندروں کی سرپرستی کے ذریعے اپنے اقتدار کو مذہبی جواز دیا، جن میں سے راشٹر اکوٹہ خاندان کی سرپرستی میں ایلورا کے غاروں میں بنے ہوئے مندر آج بھی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ چین میں ۸۵۴ء کے قریب شہنشاہ نے کنفیوشس کی تعلیمات کو اپنی حکومت کا جواز قرار دیتے ہوئے بدھ مندروں پر پابندی لگانے کی کوشش کی۔

اِسی قسم کا ہیجان قسطنطنیہ سے تعلق رکھنے والی مسیحیت کے لیے پیدا ہُوا جہاں مذہبی فیصلوں کا اعلیٰ ترین اختیار شہنشاہوں کے پاس تھا، جنہوں نے ۷۲۴ء میں حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم علیہم السلام کی تصویروں اور مجسموں کو عبادت میں استعمال کرنے پر پابندی لگائی جو ۸۴۳ء تک جاری رہی۔

مغربی یورپ میں، جہاں مسیحیت کے حوالے سے تمام مذہبی اختیار روم میں رہنے والے پوپ کے پاس تھا، بادشاہوں نے روم کے پوپ کی خوشنودی کو اپنی حکومت کا جواز قرار دیا، جس کا آغاز ۷۵۱ء میں کارولنگی خاندان کی حکومت سے ہُوا اور شارلمین نے تو خاص طور پر اپنے آپ کو مسیحیت کے محافظ کے طور پر پیش کیا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، زیادہ تر مسلمان جنہیں بعد میں سُنّی کہا گیا، یہی سمجھتے تھے کہ خلیفہ کا انتخاب اتفاقِ رائے سے ہونا چاہیے اگرچہ عملاً اِس پر عمل نہیں ہوتا تھا۔ اِس حوالے سے جو سوچ اُس زمانے میں عام تھی، اُس کا اندازہ ایک تاریخی کتاب میں درج واقعے سے لگایا جا سکتا ہے (کیونکہ یہ واقعہ تاریخی طور پر درست نہ بھی رہا ہو تو وہ لوگ تو اِسے ایک تاریخی واقعہ ہی تسلیم کرتے تھے)۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن خلیفہ مامون کے محل میں مناظرے کی مجلس قائم تھی جب ایک اجنبی شخص آیا اور مامون سے پوچھا، ”خلافت آپ نے بزور حاصل کی ہے یا دنیا کے تمام مسلمانوں نے اتفاقِ رائے سے آپ کو منتخب کیا ہے؟“ مامون نے کہا:

> نہ زور سے نہ اتفاق سے! بات یہ ہے کہ مجھ سے پہلے جماعتِ اسلام پر جو حکمران تھا [یعنی میرا باپ ہارون الرشید] اور عام مسلمان چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے اُس کی اطاعت قبول کیے ہوئے تھے، اُس نے میری ولیعہدی کے لیے عام بیعت لی اور اُس وقت جو لوگ اسلامی طاقت کے ارکان مانے جاتے تھے سب نے

معاہدۂ بیعت پر دستخط کیے۔ اُس کے انتقال کے بعد مَیں نے خیال کیا کہ جس پر دنیا کے تمام مسلمانوں کا اتفاق ہو وہ تخت نشین ہو۔ لیکن ایسا شخص نہ مل سکا۔ اور ہر ملک کے نظم و نسق کے لیے ایک قوی انتظام کی ضرورت تھی۔ ورنہ امن و امان میں خلل آتا اور عظمتِ اسلامی کے تمام اجزاً متفرق ہو جاتے۔ مجبوراً فی الحال یہ بوجھ اپنے سر لیا، اور منتظر بیٹھا ہُوں کہ جب دنیا کے تمام مسلمان اتفاقِ رائے سے ایک شخص کو منتخب کر لیں تو مَیں عنانِ حکومت اُس کے ہاتھ میں دے کر الگ ہو جاؤں۔ میں تمہیں اپنا وکیل کرتا ہُوں کہ اگر ایسا موقع آئے تو فوراً مجھے خبر کرنا![1]

سُنّیوں کے علاوہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقے اور بھی تھے۔ شیعہ (اہلِ تشیع) سمجھتے تھے کہ خلیفہ خدا کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے اور صرف اہلِ بیت یعنی آنحضورؐ کے خاندان سے ہو سکتا ہے۔ تیسرا فرقہ اپنے آپ کو شُرَاۃ اور عبادی کہتا تھا جبکہ دوسرے مسلمان اکثر اسے خوارج کا لقب دیتے تھے۔ اِن کے نزدیک خلیفہ کے انتخاب کا حق صرف اُن مسلمانوں کو تھا جو دین پر ٹھیک طریقے سے عمل کرتے ہوں (اور اِس معاملے میں بہت سے صحابہؓ بھی اِن کے معیار پر پورے نہیں اُترتے تھے)۔

*

اُس ابتدائی زمانے میں سُنیوں کی حکومت تقریباً ساری اسلامی سلطنت پر تھی کیونکہ

[1] یہ واقعہ عظیم مسلمان مؤرخ اور جغرافیہ دان المسعودی نے مروج الذھب ومعادن الجوھر میں لکھا ہے، جو ۹۵۶ء کے لگ بھگ لکھی گئی۔ شبلی نعمانی نے اسے المامون میں نقل کیا ہے، جسے ہم نے ذرا آسان زبان میں دہرایا ہے۔

عباسیوں کے علاوہ اسپین کی اُموی حکومت بھی اِسی نظریے کی سرپرستی کرتی تھی۔ شیعہ اور عبادی فرقوں کی حکومت بہت محدود علاقوں پر تھی۔[1] اِس لیے سب سے پہلے سُنّیوں نے اپنے رجحانات کے مطابق فقہ یعنی مذہب کی بنیاد پر قانون اخذ کرنے کے اصولوں کو حتمی شکل دی۔

امام ابوحنیفہ (وفات ۷۶۷ء)، امام مالک (وفات ۷۹۵ء)، امام شافعی (وفات ۸۲۰ء) اور امام حنبل (وفات ۸۵۵ء) نے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ یہ اصول طے کیے اور اکثر مسلم ریاستوں نے اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اِن میں سے کسی ایک کو رائج کر دیا۔ ۸۴۶ء سے ۸۸۶ء کے عرصے میں "صحاح الستّہ" یعنی حدیث کے وہ چھ مجموعے بھی مرتب ہو چکے تھے جو سُنّیوں کے نزدیک مستند ہیں: صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، جامع ترمذی (سنن ترمذی)، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ (اہلِ تشیع اور عبادیوں نے انہیں مستند نہیں مانا اور کچھ عرصے بعد اپنے علیحدہ مجموعے مرتب کیے)۔

اُسی زمانے میں مسلمانوں نے سائنس کو وہ ترقی دینا شروع کی جس کے نتیجے میں جدید سائنس وجود میں آئی ہے۔ یونان، فارس، ہندوستان، چین اور دُوسری تہذیبوں کے علمی ورثے کو ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے قرآن کی دی ہوئی آزادانہ رُوح کی مدد سے اُس ورثے کو مزید ترقی دی۔ سنسکرت کے ہندسے عربی میں آئے، اور آیندہ صدیوں میں یورپی زبانوں میں منتقل ہوئے۔ لہٰذا وہ ہندسے جنہیں ہم انگریزی کہتے ہیں، خود

---

[1] ۷۵۰ء سے ۹۰۰ء کا عرصہ جو یہاں زیرِ بحث ہے، اُس میں اہلِ تشیع نے مراکش (۷۸۸ء سے ۹۸۵ء) اور طبرستان (۸۶۴ء سے ۹۲۸ء)، اور عبادی (شُراۃ) نے موجودہ الجزائر کے علاقے تاھرت (۷۷۶ء سے ۹۰۹ء) اور عمان (۷۵۱ء سے آج تک) پر حکومت کی۔

مغرب میں آج تک عربی ہندسے (Arabic numerals) کہلاتے ہیں:

سنسکرت	عربی	فارسی	اُردو	انگریزی
०	٠	۰	۰	0
१	١	۱	۱	1
२	٢	۲	۲	2
३	٣	۳	۳	3
४	٤	۴	۴	4
५	٥	۵	۵	5
६	٦	۶	۶	6
७	٧	۷	۷	7
८	٨	۸	۸	8
९	٩	۹	۹	9

یہ ہندسے زیادہ تر الخوارزمی کی کتابُ الحساب الہندی (اندازاً ۸۲۵ء) کے ترجمے سے یورپ میں پھیلے۔ چونکہ لاطینی زبان میں اِس مصنف کا نام الگورِتمی (Algoritmi) لکھا جاتا تھا اِس لیے بعد میں اِسی سے لفظ "الگورِتم" (algorithm) بنایا گیا، جو آج تک استعمال ہو رہا ہے۔ الخوارزمی ہی کی ایک اور تصنیف کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ (۸۲۰ء) سے لفظ الجبرا (algebra) اخذ کیا گیا ہے کیونکہ اِسی کتاب میں پہلی دفعہ اِس علم کو جیومیٹری سے علیحدہ کر کے ایک باقاعدہ مضمون کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

دھاتوں کو آپس میں ملانے کا یونانی علم "خیمیا" عربی تراجم میں "الکیمیا" کے نام سے

متعارف ہُوا اور بعد میں یورپی زبان کے لفظ کیمسٹری (chemistry) کی بنیاد بنا۔ اِس علم کا مقصد سستی دھاتوں کو سونے میں بدلنے کا طریقہ دریافت کرنا تھا، جس میں کیمیا گروں کو کبھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔[1] لیکن عرب سائنسدان جابر بن الحیان (وفات اندازاً ۸۱۵ء) نے اِس علم کو ایسی ترقی دی کہ یہ بہت سے دُوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ جابر کے ایجاد کیے ہوئے بعض بنیادی طریقے آج بھی کیمسٹری کی تجربہ گاہوں میں رائج ہیں۔

اُس زمانے میں عورتیں بھی تقریباً ہر مضمون کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور اپنے اپنے شوق کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں تھیں۔ سائنس اور علوم وفنون میں شہرت حاصل کرنے والی خواتین کا تذکرہ تو آیندہ آئے گا لیکن اِس ابتدائی زمانے کی جو خواتین سب سے زیادہ مشہور ہوئیں اُن میں سے ایک خلیفہ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ (۸۱۱ء–۷۶۶ء) ہیں، جن کی فیاضی ضربُ المثل بن گئی۔ ایک اور خاتون فاطمہ فہری نے ۸۵۹ء میں مراکش کے شہر فاس میں القرویین قائم کی، جو دنیا کی فعال یونیورسٹیوں میں سب سے پرانی ہے۔ رابعہ بصری (وفات اندازاً ۸۰۱ء) نے تصوّف میں وہ مقام حاصل کیا کہ آج اُن کا نام خدا سے بے لوث محبت اور پرہیز گاری کی علامت ہے۔

*

''صُوفی'' کا لقب اُن لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا تھا جنہوں نے اسلام کے ابتدائی زمانے کی سادگی پر قائم رہنے کو ترجیح دی تھی۔ اِن لوگوں کا طریقہ ''تصوّف'' کہلاتا تھا

---

[1] موجودہ سائنس کا فیصلہ یہ ہے کہ صرف نیوکلیئر عمل کے ذریعے کسی دھات کو سونا بنایا جا سکتا ہے۔ یہ عمل اِتنا مہنگا ہو گا کہ اِس کے ذریعے سونا بنانے میں کسی فائدے کا امکان نہیں ہے۔

لیکن ابھی تک اِس کے کوئی باقاعدہ اُصول نہ تھے، سوائے اِس کے کہ خدا کو یاد رکھیں، عبادات میں دل لگائیں اور تمام انسانوں کو خدا کی تخلیق سمجھتے ہوئے اُن سے محبت کریں۔ بعض صوفی دنیا سے بے نیاز ہو جاتے تھے اور بعض دُنیاوی پیشوں سے بھی منسلک رہتے تھے۔ ہر صورت میں وہ بہترین رُوحانی اُستاد ثابت ہو رہے تھے اور معاشرے کی تربیت کر رہے تھے۔ اُس زمانے کے بیشمار صوفیوں میں سے رابعہ بصری کے علاوہ جو نام حد سے زیادہ مشہور ہیں، اُن میں ابراہیم ادھم (وفات اندازاً ۷۷۷ء)، بایزید بسطامی (وفات اندازاً ۸۴۸ء)، ذوالنوان مصری (وفات ۸۵۹ء) اور جنید بغدادی (وفات ۹۱۰ء) شامل ہیں۔

صوفیوں نے لوگوں کے ذہنوں پر جو اثرات مرتب کیے اُن کا اندازہ اُس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ابراہیم بن ادھم نے تاج و تخت چھوڑ کر تصوّف کا راستہ اختیار کیا۔ ضروری نہیں کہ یہ واقعہ تاریخی طور پر درست ہو لیکن جس طرح خلیفہ مامون کے بارے میں بیان کیے ہوئے ایک واقعے سے ہم نے سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ لوگ سیاست کے بارے میں کس طرح سوچ رہے تھے، اُسی طرح یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ صوفیوں کے زیرِ اثر کس طرح کی طرزِ فکر پیدا ہو رہی تھی:

> ابتدا میں ابراہیم ادھم بلخ کے سلطان تھے۔ ایک مرتبہ آپ سوئے ہوئے تھے کہ چھت پر کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ آواز دے کر پوچھا، ”چھت پر کون ہے؟“ جواب ملا، ”مَیں آپ کا ایک شناسا ہوں اور اُونٹ کی تلاش میں چھت پر آیا ہُوں۔“ آپ نے فرمایا، ”چھت پر اُونٹ کس طرح آ سکتا ہے؟“ جواب ملا، ”آپ کو تاج و تخت میں خدا کس طرح مل جائے گا؟“ یہ سن کر آپ پر ہیبت طاری ہو گئی۔
>
> دوسرے دن جب دربار جما ہُوا تھا، ایک باوقار شخص دربار میں آ پہنچا اور

سب پر ایسا رعب طاری ہُوا کہ کسی نے اُسے نہ روکا۔ وہ شخص تیزی کے ساتھ شاہی تخت کے نزدیک پہنچ کر چاروں طرف کچھ دیکھنے لگا۔ ابراہیم ادھم نے پوچھا، "تم کون ہو اور کس کی تلاش میں آئے ہو؟" اُس نے کہا، "میں یہاں رہنے آیا تھا لیکن یہ تو سرائے معلوم ہوتی ہے۔ اِس لیے یہاں رہنا ممکن نہیں۔" آپ نے فرمایا، "بھائی، یہ سرائے نہیں بلکہ شاہی محل ہے۔" اُس نے پوچھا، "آپ سے پہلے یہاں کون رہتا تھا؟" ابراہیم ادھم نے فرمایا، "میرے آبا و اجداد۔" اِسی طرح کئی پشتوں تک پوچھنے کے بعد اُس نے کہا، "اور اب آپ کے بعد یہاں کون رہے گا؟" ابراہیم ادھم نے فرمایا، "میری اولادیں۔" اُس شخص نے کہا، "ذرا تصوّر فرمایئے کہ جس جگہ اِتنے لوگ آ کر چلے گئے اور کسی کو ثبات حاصل نہ ہو سکا (یعنی کوئی ہمیشہ نہ رہ سکا)، وہ جگہ سرائے نہیں تو کیا ہے؟ [1]

حلّاج کی آواز

۹۰۰ء کے لگ بھگ ایک عجیب و غریب شخص نمودار ہُوا جس کی تعلیمات نے صوفیوں کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ وہ حسین بن منصور الحلّاج (۹۲۲ء–۸۵۶ء) تھا۔

حلّاج نے بہت سی کتابیں لکھیں لیکن اُس کی جو بات سے زیادہ مشہور ہوئی، وہ اُس کا نعرہ "انا الحق" تھا۔ اِس کے کئی مطلب لیے جا سکتے تھے، مثلاً "میں ہی سچائی ہوں"، "اَنا یعنی خودی اصل سچائی ہے" اور "میں خدا ہُوں!" اگرچہ علمائے کرام کا فیصلہ یہ تھا کہ اسلام کی رُو سے محض اِس قسم کی بات کہنے پر کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی لیکن حکومت کو

[1] شیخ فریدالدین عطار سے منسوب تذکرۃ الاولیأ میں یہ حکایت درج ہے۔

حلاج سے خطرہ محسوس ہُوا۔ ۹۱۱ء میں اُسے قید کیا گیا۔ پھر طویل عرصے بعد ۹۲۲ء میں اُسے قید سے نکال کر بغداد میں سرِ عام پھانسی دے دی گئی۔

اُس زمانے کے صوفیوں نے عام طور پر اُس کا ساتھ نہ دیا لیکن مرنے کے بعد بہت جلد وہ تمام صوفیوں اور عام مسلمانوں کے لیے خدا سے عشق کی علامت بن گیا:

منصور کو ہُوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی سے عشق کا دعویٰ کرے کوئی[1]

علامہ اقبال نے اپنی فارسی تصنیف جاویدنامہ میں دکھایا ہے کہ مولانا رُوم اُنہیں کائنات کے ایک روحانی سفر کے دوران مشتری سیارے پر پہنچتے ہیں تو وہاں حلّاج اور بعض دُوسری رُوحوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ اقبال حلاج سے پوچھتے ہیں کہ اُس نے "انا الحق" کا دعویٰ کیوں کیا؟ حلاج جواب دیتے ہیں، "میں نے ایک قوم کو دیکھا جو قبر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس کے لوگ کہتے تھے کہ وہ خدا پر یقین رکھتے ہیں لیکن وہ اپنے وجود کے منکر تھے۔ میں نے اپنی ذات میں زندگی کی آگ روشن کر دی اور مُردوں کو زندگی کے راز سکھا گیا۔ میں نے خودی کی بنیاد پر ایک نیا جہان تخلیق کیا جس میں حُسن اور قوّت کو ایک کر دیا۔"[2]

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۱۰۵

[2] یہ حلاج کے جواب کا خلاصہ ہے۔ اقبال، جاویدنامہ ص ۱۴۳ پر اصل اشعار کچھ یوں ہیں:

بود اندر سینۂ من بانگ صور — ملّتے دیدم کہ دارد قصدِ گور
مؤمناں با خوے و بوئے کافراں — لاالٰہ گویان و از خود منکراں
"امر حق" گفتند نقش باطل است — زانکہ او وابستۂ آب و گل است
من بخود افروختم نار حیات — مردہ را گفتم ز اسرار حیات
از خودی طرح جہانے ریختند — دلبری با قاہری آمیختند

یہ حقیقت ہے کہ حلاج کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے عباسی خاندان پر زوال آ چکا تھا۔ ۸۶۱ء سے خلیفہ سپہ سالاروں کے پابند ہو گئے تھے اور بعض علاقوں پر دُوسرے خاندانوں نے بادشاہتیں قائم کر لی تھیں، جو صرف رسمی طور پر خلیفہ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے لیکن عملاً اُس کے حکم سے آزاد تھے۔ چنانچہ شمالی افریقہ میں اغالبہ (۸۰۰ء سے ۹۰۰ء)، خراسان میں طاہری (۸۲۱ء سے ۸۷۳ء)، سیستان میں صفاری (۸۶۱ء سے ۱۰۰۳ء) اور مصر میں طولونی (۸۶۸ء سے ۹۰۵ء) بر سرِ اقتدار آئے۔

لیکن ۹۰۰ء کے بعد اچانک پوری اسلامی سلطنت میں ایک نئی رُوح بیدار ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ تمام تحریکیں اور رجحانات جنہیں ڈیڑھ سو برس سے عباسی خاندان نے بڑی مصلحت کے ساتھ دبایا ہُوا تھا اب ایک آتش فشاں کے لاوے کی طرح اُبلنے لگتے ہیں۔ لیکن وہ ہمیشہ دنیائے اسلام کی کمزوری کے باعث نہیں بنتے بلکہ اکثر مقامات پر ایک مضبوط اور دلکش ثقافت پیدا ہوتی ہے، جیسے واقعی خودی کی بنیاد پر نئے جہان تخلیق ہو رہے ہوں جن میں حُسن اور قوّت یکجا ہو جاتے ہوں۔

*

اِس صدی میں ہمیں عباسی سلطنت سے باہر بھی کئی مقامات پر بالکل ایسے ہی رجحانات دکھائی دیتے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ ڈیڑھ دو سو برس پہلے یعنی ۷۵۰ء کے آس پاس جگہ جگہ بغاوتیں ہوئی تھیں جنہیں کسی مرکزی طاقت نے دبا کر ملک کے اندرونی استحکام کی طرف توجہ دی تھی اور اس کے لیے سیاسی امتزاج سے کام لیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ باغی رجحانات اندر ہی اندر پنپتے رہے اور خوب ترقی پانے کے بعد اَب مختلف صورتوں میں سامنے آ گئے۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام واقعات، جن کا ابھی ذکر کیا جائے گا، حلاج کی وجہ سے پیش نہیں آئے۔ لیکن وہ اِن تمام واقعات کی بہترین علامت ضرور بن گیا۔ دُوسرے لفظوں میں زندگی کے باطن میں مچلتی ہوئی کسی لہر نے ایک طرف اِن تمام واقعات کو جنم دیا اور دُوسری طرف وہی لہر حلاج کی صورت میں ایک پیغام بن کر دنیا پر ظاہر ہو گئی۔

۹۲۹ء میں قرطبہ کے اُموی حکمراں نے عباسیوں کے مقابلے پر مسلمانوں کی خلافت کا دعویٰ کر دیا۔ اگرچہ قرطبہ کی جامع مسجد پچھلی صدی ہی میں تعمیر ہو چکی تھی لیکن اب اُسے وسعت دی گئی۔ ۹۸۷ء تک مسجدِ قرطبہ کی وہ صورت سامنے آ گئی جو آج بھی لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ:

اے حَرمِ قُرطُبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام، جس میں نہیں رفت و بود[1]

اہلِ تشیع (شیعہ) کئی شاخوں میں بٹ چکے تھے۔ امام جعفر الصادق (۷۶۵ء–۷۰۲ء) کے صاحبزادے اسماعیل کی اولاد کو امام ماننے والے اسماعیلی شیعہ کہلاتے تھے۔ ۹۰۹ء میں اِس سلسلے سے تعلق رکھنے والے عبید اللہ المہدی باللہ (دورِ حکومت ۹۰۹ء سے ۹۳۴ء) نے موجودہ تیونس پر قبضہ کر کے فاطمی خلافت کی بنیاد رکھی، جو آگے چل کر بہت وسیع رقبے پر پھیل گئی جس میں مراکش، مصر، فلسطین، یروشلم اور دُوسرے علاقے شامل تھے۔ عبداللہ نے دعویٰ کیا کہ وہ امام مہدی ہیں جن کے متعلق پیشین گوئیاں مسلمانوں میں عام تھیں۔ فاطمی حکومت، جو ۱۱۷۱ء تک قائم رہی، مذہبی رواداری اور علم و ادب کی سرپرستی کے لیے مشہور تھی۔ شیعہ، سنی اور دوسرے فرقوں کے مسلمانوں، اور یہودیوں اور مسیحیوں سمیت تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ رواداری برتی جاتی تھی۔ یہودی تو اِس

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۲۹

ریاست میں وزیر اعظم کے عہدے پر بھی مقرر کیے گئے۔

فاطمی عہدِ حکومت میں اسماعیلی فقہ کی تدوین بھی ہوئی جس کا ایک اہم سنگِ میل قاضی نعمان بن محمد (وفات ۹۷۴ء) کی کتاب دعائم الإسلام تھی، جو ۹۷۳ء کے لگ بھگ مکمل ہوئی۔ ۹۷۵ء یا اس سے چند برس پہلے فاطمیوں نے اپنے دارالخلافہ قاہرہ میں جامع الازہر قائم کی، جو دنیا کی فعال یونیورسٹیوں میں القرویین کے بعد سب سے پرانی ہے۔

اسماعیلیوں کے ایک گروہ قرامطہ نے فاطمی خلافت کے بانی کو قبول نہیں کیا اور اسماعیلی فرقے سے خارج ہو گئے۔ صحرائے عرب کے مشرقی حصے، بالخصوص بحرین، میں ۸۹۹ء سے ۱۰۷۷ء تک اِن کی حکومت رہی۔ ۹۳۰ء میں انہوں نے مکہ پر حملہ کر کے حاجیوں کو قتل کیا، خانہ کعبہ کو لُوٹا اور حجرِ اسود نکال کر لے گئے جسے عباسی خلیفہ نے بڑی مشکل سے تیئیس برس بعد ۹۵۳ء میں ان سے واپس حاصل کیا۔

اہلِ تشیع کے سب سے بڑے گروہ اِثنا عشری کے مطابق اُن کے بارہویں امام محمد المہدی ۸۷۴ء میں غائب ہو گئے اور اپنے نمائندوں کے ذریعے پیغامات بھجواتے رہے لیکن ۹۴۱ء میں یہ سلسلہ بھی ترک کر دیا اور اب قیامت کے قریب نمودار ہوں گے۔ اِس گروہ کی پہلی بڑی حکومت آلِ بویہ نامی خاندان نے ایران کے کچھ حصوں پر قائم کی جو ۹۳۴ء سے ۱۰۶۲ء تک قائم رہی۔ ۹۵۴ء سے ۱۰۵۵ء تک بویہ حکمراں عباسی دربار پر بھی چھائے رہے، اور عراق اور شام بھی عملاً انہی کے زیرِ حکومت آ گئے۔ بویہ اگرچہ شیعہ تھے لیکن اُنھوں نے سُنیوں اور دوسرے فرقوں، اور دوسرے مذاہب کے ساتھ بھی رواداری کا سلوک کیا۔

آلِ بویہ کے زمانے ہی میں شیعہ عالم شیخ مفید (وفات ۱۰۲۲ء) نے اثنا عشری فقہ کی اہم تصنیف کتاب الارشاد تصنیف کی۔ ۹۱۵ء سے ۱۰۵۰ء کے عرصے میں حدیث کے وہ

چاروں مجموعے بھی مرتب ہو گئے جو اثنا عشریہ میں مستند سمجھے جاتے ہیں، یعنی کتاب الکافی، من لا یحضرہ الفقیہ، تہذیب الأحکام اور الاستبصار۔

جیحوں اور سیحوں وسطی ایشیا کے دو مشہور دریا ہیں۔ اُن کے درمیان واقع علاقے (موجودہ ازبکستان، تاجکستان، قزاقستان اور ترکمانستان)، ماضی میں ماوراۤ النہر (Transoxiana) کہلاتے رہے ہیں۔ ۸۱۹ء سے ۹۹۹ء تک ان علاقوں اور ایران کے حصے خراسان پر سامانی خاندان کی حکومت رہی۔ دُوسرے سنّی خاندانوں کی طرح یہ بھی خلیفہ کی اطاعت کرتے تھے لیکن ۸۷۴ء کے بعد زیادہ سے زیادہ خود مختار ہوتے گئے۔ انہی کے زمانے میں فارسی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کا رواج عام ہُوا اور رُودکی (وفات ۹۴۰ء) اِس نئی فارسی کا پہلا شاعر ہُوا۔

سامانی خاندان کے ترک غلام الپ تگین نے، جو ترقی کر کے سالار کے عہدے تک پہنچا تھا، ۹۶۲ء میں غزنی میں ایک نئی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اُس کے بعد سامانیوں کا ایک اور ترک غلام سبکتگین (دورِ حکومت ۹۶۲ء سے ۹۹۷ء) بادشاہ بنا جس کے بیٹے سلطان محمود غزنوی کا تذکرہ اگلے حصے میں کیا جائے گا۔

*

اِس صدی کی سیاسی تبدیلیوں کے اثرات سائنسی علوم کی ترقی میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مسلمان سائنسدانوں نے تجرباتی طریقوں کو رواج دیا۔ بیشمار ناموں میں سے اگر صرف چند منتخب کیے جائیں تو ابو بکر محمد بن زکریا رازی (وفات ۹۲۵ء) نے طب اور دواسازی کو ترقی دی، چیچک کی تشخیص میں اہم پیش رفت کی اور کتاب الحاوی لکھی جسے صدیوں تک یورپ میں بھی علمِ طب کی انسائیکلوپیڈیا سمجھا گیا (یہ مفسرِ قرآن فخر الدین

رازی سے علیحدہ شخصیت ہیں، جن کا عرصہ حیات ۱۱۴۹ء سے ۱۲۰۹ء ہے، اور جنہوں نے تفسیرِ کبیر لکھی)۔ ہسپانیہ میں ابو القاسم الزاہراوی نے فنِ جراحی یعنی سرجری کو ایسی ترقی دی کہ اُن کے ایجاد کیے ہوئے بعض اوزار آج بھی سرجری میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ اُن کی تیس جلدوں پر مشتمل التصریف بھی علمِ طب کا انسائیکلوپیڈیا تھی، جسے صدیوں تک یورپ میں پڑھایا گیا۔

سائنسی اور فلسفیانہ علوم کی ترقی کے ساتھ ہی اِس قسم کے سوالات بھی پیدا ہوئے تھے کہ مذہبی عقیدوں کے عقلی دلائل کیا ہیں؟ یہ موضوع علم الکلام کہلایا۔ چونکہ عباسیوں نے یونانی، رومی اور دوسری تہذیبوں کی فلسفیانہ کتابوں کے تراجم کروانے کی طرف خاص توجہ دی تھی اِس لیے مسلمانوں نے علمُ الکلام کی بنیادیں بھی پرانے فلسفیانہ نظاموں، بالخصوص یونانی فلسفے پر قائم کی تھیں۔ یہ سلسلہ خلیفہ المامون کے زمانے ہی میں اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا جب عقل کو عقیدے پر ترجیح دینے کی تحریک نے زور پکڑا تھا جسے اعتزال (اور اُس کے ماننے والوں کو معتزلہ) کہتے تھے۔ افلاطون کا فلسفہ بھی، جو قدیم زمانے میں دُوسری تہذیبوں کے بیڑے غرق کر چکا تھا، اب مسلمانوں میں سرایت کرنے لگا تھا۔ اِس کی سب سے بڑی مثال اب ایک عظیم فلسفی ابو نصر فارابی (وفات ۹۵۰ء) کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

لیکن اُسی زمانے میں بعض مسلمانوں میں یہ احساس بھی بیدار ہُوا کہ قرآن کو یونانی فلسفے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کر کے اُنہوں نے سخت غلطی کی ہے اور یہ اندازِ فکر اُنہیں قرآن کی عملی رُوح سے دُور لے گیا ہے۔[1] پرانے فلسفیانہ نظاموں کے خلاف یہ فکری بغاوت علم الکلام کے ایک نئے مکتبِ فکر کی صورت میں ظاہر ہوئی جسے اشعری کہا

[1] Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, pp.3-4

جاتا ہے کیونکہ اس کے بانی ابوالحسن اشعری (وفات ۹۳۶ء) تھے۔

*

اسلامی دنیا سے باہر بھی باغیانہ رجحانات نئے گُل کھلا رہے تھے۔ شارلمین کی موت کے بعد یورپ میں زبردست انتشار پھیلا تھا۔ اب ایک جرمن سردار نے، جسے تاریخ اوطوئے اعظم (Otto the Great) کے نام سے یاد رکھتی ہے، ۹۳۶ء سے ۹۷۳ء کے عرصۂ حکمرانی میں یورپ پر بادشاہت قائم کر کے ایک پائیدار سلطنت کی بنیاد رکھی، جو بعد میں مقدس رومی سلطنت (Holy Roman Empire) کہلائی۔

ناروے، ڈنمارک اور سوئیڈن میں بسنے والے وائیکنگ قبائل نے، جو ابھی تک مشرکانہ مذہب رکھتے تھے، تقریباً ۹۳۷ء سے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا لیکن اب وہ مستحکم ریاستوں کی بنیادیں رکھنے لگے۔ ۹۱۱ء میں فرانس میں نارمنڈی کی حکومت قائم کی۔ ۹۳۰ء میں آئس لینڈ میں پارلیمنٹ بنائی جو آج تک قائم ہے اور دنیا کی فعال پارلیمنٹوں میں سب سے پرانی سمجھی جاتی ہے۔ ۹۵۸ء سے ۹۹۵ء کے درمیان مختلف وائیکنگ بادشاہ نہ صرف ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کی ریاستوں کی بنیادیں رکھ چکے تھے بلکہ مسیحیت بھی قبول کر چکے تھے۔

مشرق کی طرف چین میں ۹۰۷ء میں تانگ سلطنت کے خاتمے پر خاصا انتشار پھیل گیا لیکن ۹۶۰ء میں سانگ خاندان نے چین کو متحد کر کے ایک عظیم الشان حکومت کی بنیاد رکھ دی جو خوشحالی اور علوم و فنون کی ترقی کے لیے مشہور ہوئی۔ مشرقِ بعید میں ۹۳۶ء میں گوریو (Goryeo) خاندان نے اُس جزیرہ نما کو متحد کیا جسے آج بھی اُس خاندان کے نام پر کوریا کہا جاتا ہے۔

دُور افریقہ میں ۹۵۰ء کے قریب ”عظیم زمبابوے“ کا شہر نمودار ہو رہا تھا۔ دنیا کے دُوسری طرف میکسیکو کے علاقے میں مایا تہذیب، جس کے پرانے شہر زوال کے شکار ہو چکے تھے، چیچن اِتزا کا عظیم شہر تخلیق کر رہی تھی۔

سنہری دَور

دنیا بھر میں ایسی مقامی حکومتیں اُبھر رہی تھیں جنہوں نے بے پناہ قوت اور شان و شوکت حاصل کرنے کے باوجود اپنی اپنی تہذیوں کی مرکزیت کے ساتھ تعلق برقرار رکھا۔ اسلامی، مسیحی، ہندو، چینی اور جاپانی تہذیبوں میں اِس زمانے میں ایسی حکومتوں کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں جو محدود رقبے اور مختصر دورانیے کے باوجود اپنی اپنی تہذیبوں کے لیے ہمیشہ زندہ رہنے والی مثالیں بن گئیں۔

اسلامی دنیا میں محمود غزنوی نے ۹۷۷ء سے ۱۰۳۰ء تک افغانستان پر حکومت کی۔ اُس کا دارلحکومت غزنی تھا جسے اُس نے علم و فن، تہذیب اور سائنسی ترقی کا عظیم مرکز بنا دیا۔ افغانستان کے مشرقی حصے سے لے کر پنجاب کے بعض علاقوں تک اُس زمانے میں ایک ہندو خاندان کی حکومت تھی، جسے ہندوشاہی کہا جاتا ہے۔ اِس خاندان کے راجہ جے پال نے محمود کے والد سبکتگین کے زمانے میں ۹۷۷ء میں غزنی پر حملہ کیا۔ سبکتگین نے اُسے شکست دینے کے بعد اُس کے ساتھ امن کا معاہدہ کیا جسے جے پال نے توڑ دیا۔

محمود کے زمانے میں جے پال کے بیٹے انند پال نے بہت سی ہندو ریاستوں کو محمود کے خلاف متحد کر دیا۔ اِن حالات میں محمود نے ہندوستان پر تقریباً سترہ حملے کیے، اور ہندوشاہی سلطنت کے تقریباً علاقے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے۔ اپنے آزاد کیے ہوئے

غلام ملک ایاز کو لاہور کا گورنر مقرر کیا، جس نے اِس شہر کو وہ نئی زندگی عطا کی جو آج تک جاری ہے۔ ایاز کی محمود کے ساتھ وفاداری اور محمود کی طرف سے اُس کی خدمات کی قدردانی اسلامی ادب میں ایک ضربُ المثل کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

دُوسری جانب محمود نے ایران اور وسطی ایشیا کے بعض حصے بھی فتح کیے۔ ان تمام جنگوں میں اُسے کبھی شکست نہیں ہوئی اِس لیے اُسے سکندرِ ثانی یعنی دوسرا اسکندرا عظم بھی کہا جاتا ہے۔ وہ عباسی خلیفہ کا وفادار ہونے کے ساتھ ساتھ پہلا مسلمان حکمراں تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔

محمود کے بعد غزنی کی سلطنت زوال کی طرف بڑھنے لگی لیکن کسی نہ کسی طرح ۱۱۸۶ء تک باقی رہی۔ ۱۰۳۷ء میں ایک اور ترک خاندان سلجوق نے ایران اور وسطی ایشیا میں اپنی حکومت قائم کی جو ۱۱۹۴ء تک قائم رہی۔

۱۰۵۵ء میں اِس خاندان بغداد پر بھی تسلط قائم کیا اور عباسی خلفائ آلِ بویہ کے بجائے سلجوقیوں کے زیرِ اثر آ گئے۔ اِس خاندان کے بادشاہوں میں سلطان طغرل اور سلطان سنجر خاص طور پر مشہور ہیں۔

۱۰۳۷ء میں جب یہ خاندان وسطی ایشیا میں اپنی حکومت قائم کر رہا تھا تو اِسی خاندان کی ایک اور شاخ موجودہ ترکی کے حصے اناطولیہ میں اپنے اقتدار کی بنیاد رکھ رہی تھی۔ چونکہ یہ علاقے مدت تک مشرقی رومی سلطنت کے زیرِ اثر رہے تھے (جو بعد میں بازنطینی سلطنت کہلائی)، اِس لیے مسلمان اِن علاقوں کو بھی روم ہی کہتے تھے۔ اِس طرح سلجوقیوں کی یہ شاخ رومی سلجوق کہلائی اور ۱۳۰۸ء تک اقتدار میں رہی۔

۱۰۹۴ء میں مصر کی فاطمی خلافت میں جانشینی کا ایک تنازعہ پیدا ہُوا اور اسماعیلی دو شاخوں میں بٹ گئے۔ اُن میں سے مستعلی (جن کے زیادہ تر گروہ موجودہ زمانے میں

بوہری کہلاتے ہیں) بدستور فاطمی سلطنت کے حکمراں رہے۔ دُوسری شاخ سے تعلق رکھنے والے نزاری کہلائے (جن کا سلسلہ اب آغا خانی کہلاتا ہے)۔ یہ لوگ مصر سے نکل گئے لیکن چار سال پہلے، ۱۰۹۰ء میں، ایک اسماعیلی حسن صباح نے شام اور ایران کے بعض دشوار گزار پہاڑی علاقوں کے قلعوں پر قبضہ کر کے جو دعوتی نظامِ حکومت قائم کیا تھا، وہ ۱۲۵۶ء تک اِن کے قبضے میں رہا۔

زنگی خاندان نے ۱۱۲۷ء سے ۱۲۵۹ء تک عراق، شام، لبنان اور آس پاس کے بعض علاقوں پر حکومت کی۔ اس کے بادشاہوں میں نورالدین زنگی خاص طور پر مشہور ہے۔ اسی کے نمایندے کے طور پر صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۷۱ء میں مصر پر فاطمی حکومت ختم کر کے زندگی حکومت قائم کی اور ۱۱۷۴ء میں زنگی کی وفات کے بعد ایوبی خاندان کی حکومت قائم کی جو ۱۲۵۰ء تک قائم رہی۔

مغربی افریقہ میں ۱۰۴۰ء سے ۱۱۴۷ء تک مرابطین نے حکومت کی، جن میں سے یوسف بن تاشفین اسپین پر حملہ کر کے وہاں کی ابھرتی ہوئی مسیحی طاقتوں کو شکست دینے کے لیے مشہور ہے۔ ۱۱۲۱ء سے ۱۲۶۹ء تک یہاں موحدین کی حکومت رہی۔

*

اسلامی دنیا سے باہر بھی ایسی چھوٹی چھوٹی حکومتیں اُبھر رہی تھی جو اپنے محدود رقبے یا مختصر دورانیے کے باوجود اپنی اپنی تہذیبوں کے ساتھ سختی سے جُڑی ہوئی تھیں۔ مثلاً چین اُس زمانے میں سانگ (Song)، لیاؤ (Liao) اور ایگزیا (Xia) حکومتوں کے درمیان تقسیم رہا لیکن یہ تینوں حکومتیں چینی تہذیب اور کنفیوشس کی تعلیمات کے ذریعے ایک مشترکہ ورثے کو ترقی دے رہی تھیں۔

مسیحی دنیا میں بھی یہی رجحان دیکھنے میں آیا، اگرچہ ۱۰۵۴ء میں وہاں رومن کیتھولک اور مشرقی آرتھوڈوکس چرچ نے ایک مذہب ہونے کے باوجود دو علیحدہ روایات کی حیثیت اختیار کرلی۔ رومن کیتھولک چرچ میں روم میں مقیم پوپ کو حتمی اختیار حاصل تھا، جبکہ مشرقی آرتھوڈوکس روایت میں تمام علاقائی بشپ برابر کے اختیارات رکھتے تھے اور قسطنطنیہ کے بشپ کو صرف ایک اعزازی قیادت حاصل تھی۔ بالآخر روم کے پوپ اور قسطنطنیہ کے بشپ نے ایک دوسرے کو مسیحی برادری سے خارج قرار دے دیا، جس کے بعد ہر مسیحی حکومت کو اِن دو روایات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑا۔

رومن کیتھولک دنیا میں وسطی یورپ پر مقدس رومی سلطنت کا اثر و رسوخ قائم تھا، لیکن علاقائی حکومتیں بھی ابھر رہی تھیں۔ مثلاً فرانس میں کاپے (Capet) خاندان کی حکومت ۹۸۷ء سے ۱۳۲۸ء تک قائم رہی، مگر ابتدائی طور پر وہ عملاً صرف پیرس اور آس پاس کے محدود علاقے پر قابض تھے۔ باقی فرانس میں طاقتور جاگیردار موجود تھے جو صرف رسمی طور پر کاپے بادشاہوں کی اطاعت کرتے تھے لیکن تب بھی ایک مشترکہ فرانسیسی شناخت کی بنیاد پڑتی گئی۔

۱۰۶۶ء میں انہی جاگیرداروں میں سے ایک انگلستان فتح کر کے ولیم فاتح اور ولیم اول کے نام سے وہاں بادشاہ بن گیا۔ چونکہ وہ اپنی فرانسیسی جاگیر نارمنڈی سے دستبردار نہیں ہوا اِس لیے تاریخ میں ایک دلچسپ صورتِ حال پیدا ہوئی۔ ایک طرف ولیم اور اس کے جانشینوں کے تحت وہ نظام ابھرنا شروع ہوا جو آگے چل کر انگلستان کے غیر تحریری آئین کی بنیاد بنا۔ دُوسری طرف، فرانس کے ایک جاگیردار کی حیثیت سے یہی انگریز بادشاہ کبھی کاپے خاندان کے سامنے رسمی اطاعت پر مجبور ہوئے، اور کبھی خود فرانس کے تاج و تخت کے دعویدار بھی بنے۔ اس طرح ایک طرف انگلستان میں فرانسیسی ثقافت کو برتر سمجھنے کا

رجحان پیدا ہوا اور دوسری طرف، فرانس کے خلاف طویل جنگی کشمکش شروع ہوئی جو اُنیسویں صدی تک جاری رہی۔

اسی زمانے میں مسیحی دنیا کے بعض رجحانات اسلامی تہذیب کے ساتھ اِس طرح ٹکرائے کہ بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے۔ سسلی بحیرۂ روم میں سب سے بڑا جزیرہ ہے (اور اب اٹلی میں شامل ہے)، جسے عرب صقلیہ کہتے تھے اور ۸۲۷ء سے ۹۰۲ء کے دوران میں اِسے فتح کر کے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا ایک اہم ترین مرکز بنا دیا تھا۔ ۱۰۶۱ء سے ۱۰۹۱ء کے عرصے میں فرانس کے علاقے نارمنڈی سے تعلق رکھنے والے بعض مسیحی مہم جوؤں نے یہاں عربوں کی حکومت کا خاتمہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خُونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کُہن کو جن کی تیغِ نا صبور
مُردہ عالَم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہُوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہُوا[1]

ہسپانیہ کی مسیحی ریاستیں بھی وہاں کی اسلامی حکومتوں کو ختم کرنے کی کوشش میں پہلے سے

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۱۴۱

زیادہ سر گرم ہوئیں جن میں قشتالہ (Castile) کا حکمراں الفانسو اور اُس کا دلیر سپہ سالار السید رودریگو (El Cid Rodrigo Díaz de Vivar) پیش پیش تھے۔ ہسپانیہ (موجودہ اسپین اور پرتگال) کی مسلم حکومت، جسے اندلس کہا جاتا تھا، اب کئی کمزور ریاستوں میں تقسیم ہو چکی تھیں:

جو مری تیغِ دو دم تھی، اب مری زنجیر ہے
شوخ و بے پروا ہے کتنا خالقِ تقدیر بھی![1]

افریقہ کے مرابطین خاندان کا حکمراں یوسف بن تاشفین مقابلے پر آیا اور ۱۰۸۶ء میں جنگِ زلاقہ میں الفانسو کو شکست دے کر اندلس پر اپنی حکومت قائم کر دی۔

*

۱۰۹۵ء میں پوپ اربن ثانی (Pope Urban II) نے تمام رومن کیتھولک مسیحیوں کو جہاد کی دعوت دی تا کہ یروشلم کو مسلمانوں سے واپس لیا جائے جو زوال پذیر فاطمی حکومت کے تصرّف میں تھا۔

یہ اسلام اور مسیحیت کے اُس تصادم کا آغاز تھا جس کے تحت ۱۰۹۶ء سے ۱۲۷۰ء تک آٹھ صلیبی جنگیں (Crusades) ہوئیں اور صلیبیوں کے لشکر یورپ سے مشرقِ وسطیٰ کی طرف روانہ ہوتے رہے۔ پوپ اربن کے الفاظ، ''خدا کا حکم ہے'' (لاطینی میں ''*Deus vult!*'' اور انگریزی میں ''God wills it!'')، اُن کا نعرہ تھے۔ ۱۰۹۹ء میں انہوں نے یروشلم کو فتح کر کے وہاں تقریباً ہر مسلمان کو قتل کر دیا اور یہودیوں کو اُن کی عبادت گاہوں میں زندہ جلا ڈالا۔ مشرقِ وسطیٰ میں صلیبیوں کی حکومت ۱۲۹۱ء تک مختلف مسیحی

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۳۷

ریاستوں کی صورت میں قائم رہی اگرچہ یروشلم ۱۱۷۸ء میں اس کے ہاتھ سے نکل گیا (جس کا ذکر اگلے حصے میں آرہا ہے)۔

مشرقی رومی (بازنطینی) سلطنت صلیبیوں کی نظر میں کافر تھی اِس لیے اُس نے اِن جنگوں میں صلیبیوں سے اپنے علاقوں کو بچانے کے سوا اور کوئی حصہ نہ لیا۔ لیکن رومی سلجوقیوں کے ساتھ جھڑپیں ضرور ہوئیں جن کا سلسلہ ۱۱۷۶ء میں ایک بڑی جنگ پر ختم ہوُا۔ اُس کے بعد سلجوقیوں اور رومیوں کی توجہ اپنی اپنی سلطنتوں تک محدود ہو گئی۔

*

۱۰۰۰ء سے ۱۱۷۶ء کے عرصے میں اسلامی، مسیحی اور چینی تہذیبوں نے سیاست اور بندوبستِ ریاست کے وہ بنیادی اصول بھی تحریر کیے جو صدیوں تک رائج رہنے والے تھے۔

اسلام کے سیاسی اصولوں پر پہلی مفصل کتاب الاحکام السلطانیہ ۱۰۳۰ء کے قریب الماوردی نے تحریر کی۔ اِس موضوع پر دُوسری سب سے اہم کتاب سیاست نامہ سلجوق خاندان کے وزیرِ اعظم نظام الملک طُوسی نے ۱۰۹۱ء کے قریب لکھی۔ اگرچہ یہ دونوں کتابیں سُنّی نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں لیکن آیندہ صدیوں میں دُوسرے مکاتیبِ فکر نے بھی اِن کے بعض پہلوؤں سے فائدہ اُٹھایا۔ الماوردی کی کتاب تو بیسویں صدی میں علامہ اقبال کی سیاسی فکر کی بنیاد بھی بنی اور اِس طرح آل انڈیا مسلم لیگ اور خود پاکستان کے سیاسی نظریے کی اساس یہی کتاب قرار پاتی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں مسلم دنیا کی بعض دوسری کامیاب سیاسی تحریکوں مثلاً اتاترک کے جدید ترکی کی بنیاد بھی اِسی کتاب میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

۱۱۴۰ء کے قریب ایک یورپی ماہرِ قانون گریشین (Gratian) نے رومن کیتھولک

چرچ کے آئینی اصولوں کی پہلی مفصل کتاب ڈکریٹم (Decretum) لکھی جو ۱۹۱۸ء تک رائج رہی۔ دوسری طرف مشرقی رومی (بازنطینی) سلطنت میں ۱۱۴۰ء کے قریب ایک شہزادی اینا کومنین (Anna Komnene) کی لکھی ہوئی الیگزیاڈ (The Alexiad) مشرقی آرتھوڈوکس مسیحیت کے خدائی حقِ حکمرانی کے تصوّر کو سمجھنے اور اُس تصوّر کے مطابق احکامِ سلطنت کی تشریح کے لیے بنیادی کتاب قرار پائی۔ چین میں شاعر، مصنف اور مصوّر سوشی (Su Shi) اور اُس کے بعض ہمعصروں نے ۱۰۵۰ء سے ۱۱۰۰ء کے درمیان چینی سیاست اور بندوبستِ ریاست کے موضوع پر مضامین تحریر کیے جن سے مشرقِ بعید میں آج بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔

سائنسی ترقی میں یہ مسلم تہذیب کا نقطۂ عروج تھا۔ اُس عہد کے بیشمار نامور سائنسدانوں میں سے ابوریحان البیرونی (وفات ۱۰۵۰ء) نے سلطان محمود غزنوی کی سرپرستی میں سائنس، جغرافیے اور تاریخ کے میدانوں میں عظیم کارنامے انجام دیئے جن میں کتابُ الہند بھی شامل ہے۔ اُس میں ہندوؤں کی تاریخ اور تہذیب کو بیان کرنے میں ایسی غیر جانبداری، ہمدردی اور تحقیق سے کام لیا گیا کہ یہ کتاب آج تک اِس موضوع پر سند سمجھی جاتی ہے۔

اسلامی تہذیب کے سب سے مشہور سائنسداں بوعلی سینا (وفات ۱۰۳۷ء) کی کتاب القانون فی الطب صدیوں تک یورپ اور مسلم دنیا میں طب کی مستند سمجھی گئی، اور دوسری طرف فلسفے اور مذہبی فکر میں اُس کی تصانیف، بالخصوص ارسطو کے افکار کی تشریح کی وجہ سے اُسے دنیائے اسلام اور یورپ دونوں میں ارسطوئے ثانی کا لقب دیا گیا۔

عراق اور مصر میں ابن الہیثم (وفات ۱۰۴۰ء) نے تجرباتی فزکس کی بنیاد رکھی، اور روشنی اور بینائی کے بارے میں وہ سائنسی تحقیقات پیش کیں جنہوں نے آگے چل کر

کیمرے جیسی ایجادات کو ممکن بنایا۔

عمر خیام (وفات ۱۱۳۱ء) نے ریاضی، فلکیات اور فلسفے کے میدان میں بڑے کارنامے انجام دیئے اگرچہ آج اُس کی شہرت سب سے زیادہ اُس کی فارسی رباعیات کی وجہ سے ہے۔

سائنس کی طرح مذہبی فکر میں بھی یہ اسلامی تہذیب کا نقطۂ عروج تھا۔ اُس دور کے روشن ترین ستاروں میں قرطبہ کے امام ابن حزم (وفات ۱۰۶۴ء) اور امام غزالی (وفات ۱۱۱۱ء) سب سے مشہور ہیں۔ امام غزالی کی تصانیف نے، جن میں احیاألعلوم فی الدین سب سے مشہور ہے، اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کی فکر کو بھی متاثر کیا۔ اُن کا بنیادی مقصد مذہب کو فلسفے کی قید سے آزاد کرنا تھا۔

مسلم ریاستوں میں یہودیوں کو دوسری جگہوں سے زیادہ آزادی حاصل تھی اس لیے یہاں یہودی مذہبی فکر نے بھی ترقی کی جن میں یہودا ہلیوی (وفات ۱۱۴۱ء) کی کتاب الخزری خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں یہودیت کا دفاع ایک خیالی مناظرہ کے ذریعے کیا گیا ہے۔

چین میں بھی اسی زمانے میں بڑے نامور مذہبی مفکرین گزرے جن میں سے چینگ یِی (Cheng Yi) متوّفی ۱۱۰۷ء اور اُس کا فکری جانشین ژوشی (Zhu Xi) متوّفی ۱۲۰۰ء کنفیوشس کی تعلیمات کی تجدید کرنے میں ایک طرح سے وہی مقام رکھتے ہیں جو مسلم فکر کے احیا میں امام غزالی کو حاصل ہے۔

*

تعلیم کے میدان بھی اِس زمانے میں وہ بنیادیں رکھی گئیں جو آج تک قائم ہیں۔

سلجوقیوں کے وزیرِ اعظم نظام الملک طُوسی نے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اسلامی دنیا میں پہلی دفعہ ریاستی سرپرستی میں چلنے والے اعلیٰ تعلیمی اداروں کا پورا سلسلہ قائم کیا۔ یہ ادارے مدرسہ ٔنظامیہ کہلاتے تھے اور بغداد سمیت کئی شہروں میں موجود تھے۔ انہوں نے قراوئین اور الازہر کی یونیورسٹیوں پر بھی اثر ڈالا جو پہلے قائم ہو چکی تھیں۔

اس زمانے میں اسلامی دنیا کے کئی بڑے شہروں، مثلاً قرطبہ، قاہرہ اور بغداد میں یہودیوں کے اعلیٰ تعلیمی ادارے بھی قائم ہوئے۔ یورپ کی سب سے پرانی فعال یونیورسٹی، بولونیا یونیورسٹی ۱۰۸۸ء میں قائم ہوئی جو آگے چل کر آکسفورڈ جیسی یونیورسٹیوں کے لیے بھی ایک نمونہ بنی۔ چین میں شاہی ملازمت میں داخلے کے امتحان کے نصاب نے بھی ۱۰۵۰ء کے قریب اپنی ترقی یافتہ صورت اختیار کی۔

تصوّف کے بنیادی اصول بھی اِسی زمانے میں مرتب ہوئے اور کئی ایسی تصانیف سامنے آئیں جو آج تک اِس موضوع پر سند سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت کشف المحجوب کو حاصل ہے، جس کے مصنف علی ہجویری (وفات ۱۰۷۲ء) کا مزار لاہور میں ہے جہاں اُنہیں داتا گنج بخش کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

*

زندگی کے تمام شعبوں میں یہ بہاریں جن کا ابھی ذکر کیا گیا ایک طرح سے اُس حیرت انگیز ترقی کے اثرات تھے جو اُس زمانے میں ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں ہو رہی تھی۔

نئی ابھرتی ہوئی زبانوں میں وہ شاہکار تخلیق کیے جا رہے تھے جو اُن زبانوں کی ادبیات کے لیے سنگِ بنیاد بن گئے، اور پہلے سے موجود ادبی اور تہذیبی روایات میں بھی نئے موڑ آ رہے تھے۔ مثلاً ہندو مت کے بعض عظیم ترین مندر اِسی زمانے میں تعمیر ہوئے، جن میں

موجودہ بھارت میں بریہدیسور، کھجوراہو اور ہوئسیلسورا، کمبوڈیا میں انگکور واٹ اور بنتے سری، کمبوڈیا اور تھائی لینڈ کی سرحد پر پریاہ ویہیر مندر، اور ویتنام میں مائی سون کے منادر شامل ہیں۔ اِس قسم کے مندر اُس زمانے میں اِتنے اہم تھے کہ خود ہندو حکمراں ایک دوسرے کی ریاستوں پر حملہ کرتے ہوئے بعض اوقات اُن کے مندروں کو تباہ کرنا یا لُوٹنا ضروری سمجھتے تھے۔ گجرات (موجودہ بھارت) میں سومنات کا مندر اِس سلسلے میں خاصا مشہور ہے جسے ہندو حملہ آوروں نے بھی تباہ کیا اور بعد میں سلطان محمود غزنوی نے بھی ۱۰۲۵ء میں اُس پر حملہ کیا۔

عربی زبان صدیوں سے ترقی کی منزلیں طے کرتی آ رہی تھی لیکن شام کے نابینا فلسفی، شاعر اور مصنف ابوالعلا معری (وفات ۱۰۵۷ء) نے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ آنحضورؐ کی معراج کا واقعہ اِن تمام صدیوں میں مسلمانوں کی گہری دلچسپی کا موضوع رہا تھا اور بعض صوفیائے کرام نے بھی اپنے روحانی تجربات بیان کیے تھے جن میں اُنھوں نے دُوسری دنیا کے بعض مقامات کا مشاہدہ کیا تھا۔ لیکن معری نے ۱۰۳۲ء کے قریب رسالۃ الغفران میں ایک شخص ابن القارح کے جنت اور جہنم کے فرضی سفر کی داستان کے ذریعے ادب، فلسفے، مذہب اور زندگی کے اہم مسائل پیش کیے۔ آیندہ صدیوں میں معری کی اِس کتاب کے براہِ راست یا بالواسطہ اثر سے جو شاہکار وجود میں آئے اُن میں ابن عربی کی فتوحاتِ مکیہ، اطالوی زبان کے شاعر دانتے کی ڈیوائن کامیڈی اور علامہ اقبال کی جاوید نامہ (۱۹۳۲) شامل ہیں۔

زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والی جن اہم تصانیف کا ذکر اِس زمانے کے حوالے سے پہلے ہی کیا جا چکا ہے، اُن میں سے بھی بعض اپنی اپنی زبانوں کی ادبیات میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں، جیسے گریشین کی ڈکریٹم، اینا کومنین کی الیگزیاڈ، سوشی اور

اُس کے معاصرین کے مضامین، نظام الملک کی سیاست نامہ، عمر خیام کی رباعیات، غزالی کی احیأ العلوم، یہودا ہلیوی کی کتاب الخزری اور بہت سی دُوسری تحریریں جو اِسی زمانے میں وجود میں آئیں۔

نئی اُبھرتی ہوئی زبانوں میں سے پُرانی نارس (Old Norse) زبان کی اہم ترین نظمیں، جو شاعرانہ ایڈا (Poetic Edda) کہلاتی ہیں، آئس لینڈ میں ۹۰۰ء سے ۱۲۰۰ء کے درمیان تخلیق ہوئیں لیکن اُن میں سے اہم ترین غالباً ۱۰۰۰ء سے ۱۱۵۰ء کے درمیان کی ہیں۔ یہ اوڈن، تھور اور لوکی جیسے مشہور دیومالائی کرداروں کی سب سے بڑی مآخذ مانی جاتی ہیں۔ جاپان میں ایک خاتون مصنفہ موراساکی شکیبو (Murasaki Shikibu) نے ۱۰۰۸ء کے قریب گنجی کی کہانی (The Tale of Genji) لکھی جس نے جاپانی ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ پرانی انگریزی زبان (Old English) کی پہلی طویل نظم بیوولف (Beowulf) اس زمانے سے قبل تخلیق کی جا چکی تھی لیکن اُس کا اولین دستیاب مسودہ بھی ۱۰۰۰ء سے بیس پچیس برس پہلے یا بعد لکھا گیا۔ فرانسیسی کی پہلی طویل نظم نغمۂ رُولاں (The Song of Roland) ۱۰۹۵ء کے قریب لکھی گئی، جس نے اسلام کے خلاف مسیحی صلیبی آئیڈیلز کو واضح طور پر پیش کر کے فرانس کی مسیحی قومی شناخت کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اسلامی دنیا میں فارسی نے عربی رسم الخط کے ذریعے ایک نئی زندگی حاصل کی تھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ ۱۰۱۰ء میں عظیم شاعر ابوالقاسم فردوسی (وفات ۱۰۱۹ء) نے اس زبان کی پہلی طویل نظم شاہنامہ مکمل کی جس میں ایران کی تاریخ بیان کی گئی تھی۔ اگرچہ اُس میں فرضی قصے بھی شامل تھے، جیسے بادشاہ جمشید کا طلسمی پیالہ "جامِ جم" جس میں بادشاہ دنیا بھر کے حالات دیکھ لیتا تھا، اور بہادر پہلوان رُستم جو انجانے میں اپنے بیٹے

سہراب کو قتل کر بیٹھتا ہے۔ لیکن تب بھی فردوسی نے کئی صدیوں کی داستان عوام کے ہاتھوں میں دے کر اُن میں اپنی تہذیب کے تسلسل کا احساس بیدار کر دیا، جس میں پارسی اور اسلامی روایات یکجا تھیں۔ علامہ اقبال نے فردوسی کو وہ "دیدہ ور" یعنی بصیرت رکھنے والا کہا ہے جس کی وجہ سے عجم یعنی فارسی اثرات رکھنے والی مسلم دنیا نے، جس میں برصغیر بھی شامل ہے، تیز نگاہ حاصل کی:

یہ کہتا ہے فردوسیٔ دیدہ ور عجم جس کے سُرمے سے روشن بصر[1]

یہ نظم سلطان محمود غزنوی کے دَور میں لکھی گئی تھی۔ تقریباً اُسی زمانے میں سلجوق خاندان کے عروج کے ساتھ ترکی زبان بھی عربی رسم الخط اختیار کر کے ترقی کرنے لگی تھی۔ ۱۰۷۰ء میں یوسف خاص حاجب نے قُتادُ غُو بِلِگ (یعنی "قابلِ سعادت علم") لکھی، جسے ترکی زبان کی پہلی عظیم نظم اور ترکی ادبیات کی ایک اہم ترین بنیاد سمجھا جاتا ہے۔

فارسی کے شاعر حکیم سنائی غزنوی نے، جن کی وفات ۱۱۴۱ء کے قریب ہوئی، اپنی کتاب حدیقۃ الحقہ (تقریباً ۱۱۳۱ء) میں صوفیانہ خیالات کو طویل مثنوی کی صورت میں بیان کرنے کی بنیاد رکھی۔ اِس کتاب اور دُوسری شعری تصانیف کے ذریعے اُنہوں نے احساس دلانے کی کوشش کی کہ آنحضورؐ کے اثر سے انسانی تہذیب ایک خاص انداز میں ترقی کر رہی ہے جس کے مراحل بتدریج سامنے آ رہے ہیں اور آتے رہیں گے۔ زندگی کے کسی بھی شعبے میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لے کر ہم دراصل آنحضورؐ کی شخصیت کے اِنہی اثرات کے کسی نہ کسی پہلو کو اپنے زمانے کے لحاظ سے دریافت کر رہے ہوتے ہیں۔ اقبال نے سنائی کے اِس پیغام کا خلاصہ اِس طرح پیش کیا ہے:

وہ دانائے سُبل، ختم الرُّسل، مولائے کُلؐ جس نے

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۲۱۳

غُبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قُرآں، وہی فُرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ[1]

حکمرانوں، مفکروں اور سائنسدانوں کے ذریعے اِس ترقی کے ظاہری پہلو سامنے آ رہے تھے۔ صوفیوں نے چونکہ ہر مصلحت کو نظر انداز کر کے اسلام کی اصل سادگی کے مطابق عمل کیا تھا اِس لیے وہ اِس ترقی کے باطنی اور روحانی پہلوؤں کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اُسے صرف تجربے سے محسوس کیا جا سکتا تھا، جس کے لیے سنائی نے حسن و عشق کے استعارے استعمال کیے۔

محبت کا یہ پیغام نہایت بروقت تھا۔ انسانیت اُس وقت ایک ایسے موڑ پر کھڑی تھی جب تقریباً ہر تہذیب میں چھوٹی چھوٹی طاقتیں اپنی اپنی جگہ خوب آن بان دکھا رہی تھیں لیکن اپنی اپنی تہذیبوں کو کسی بڑی تباہی سے بچانے کے لیے متحد ہونے کی صلاحیت سے یکسر محروم تھیں۔

اسلامی دنیا میں خلافتِ عباسیہ جو صرف برائے نام رہ گئی تھی، غزنوی، سلجوقی، زنگی، اسماعیلی، افریقی اور اندلسی اور دوسرے حکمراں اپنی اپنی جگہ کسی سے کم نہ تھے لیکن نہ اسلامی دنیا کو اندرونی فساد سے روکنے کے قابل تھے اور نہ ہی اُن میں یہ صلاحیت تھی کہ صلیبیوں کے مقابلے پر متحد ہو سکتے جنھوں نے ستّر بہتّر سال سے یروشلم پر قبضہ کر کے دنیائے اسلام کے قلب میں اپنی حکومت قائم کر رکھی تھی۔

خود صلیبیوں اور مسیحیوں کی یہ حالت تھی کہ یورپ سے جو نئے صلیبی لشکر چلتے تھے وہ اکثر دُوسری مسیحی حکومتوں میں خونریزی کرتے ہوئے آتے تھے۔ کم و بیش یہی حالت

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۴۱

دوسری بڑی تہذیبوں کی تھی۔

حکیم سنائی اور اُن کے ہمعصر صوفی انسانیت کے باطن میں جھانک کر دیکھ رہے تھے کہ جو بھی تہذیب اپنے عناصر کو متحد کرنے میں ناکام رہی، وہ اُن طوفانوں کا سامنے نہیں کر سکے گی جو بہت جلد اُٹھنے والے تھے:

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جُدائی
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے، خدائی![1]

آخری چٹان

فارسی کے ایک اور شاعر شیخ فریدالدین عطار نے ۱۱۷۷ء میں (اور بعض محققین کے مطابق چند برس بعد) سنائی کی روایت میں ایک مثنوی لکھی جس کا عنوان منطق الطیر (پرندوں کی گفتگو) تھا۔ دیباچے میں اُنہوں نے مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ تعصب اور فرقہ پرستی چھوڑ کر متحد ہو جائیں کیونکہ خلافت کا فیصلہ صرف اُمت کے اتفاقِ رائے کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اُس کے بعد اُنہوں نے ایک کہانی بیان کی جس میں پرندے اِس بات پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں کہ کوئی حکمراں نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے معاملات بدانتظامی اور انتشار کے شکار ہیں۔ لہٰذا وہ سب اپنے بادشاہ کی تلاش میں نکلتے ہیں جس کا نام سیمرغ ہے لیکن جسے کسی نے دیکھا نہیں ہے۔ راستے میں سات دشوار گزار وادیاں آتی ہیں۔ صرف تیس پرندے ان تمام وادیوں سے صحیح سلامت گزر کر سیمرغ کے دربار تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر وہ دیکھتے ہیں کہ وہ سب مل کر خود ہی سیمرغ ہیں

---

[1] اقبال، ضربِ کلیم، ص ۱۷۸

کیونکہ فارسی میں "سی" کا مطلب تیس اور "مرغ" کا مطلب پرندہ ہے!

جس طرح عطار نے تصوّف اور روحانیت کو ایک سیاسی پروگرام میں تبدیل کیا جس کا بنیادی نکتہ اتحاد اور اتفاقِ رائے تھا، اُسی طرح کوہِ قاف کے دوسری طرف گنجہ کے شہر (موجودہ آذربائیجان) میں اُن کے ہمعصر نظامی گنجوی یہ کام کر رہے تھے۔ ۱۱۶۳ء سے ۱۲۰۲ء کے درمیان اُنھوں نے فارسی میں پانچ عظیم مثنویاں لکھیں جنھوں نے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، بہرام گور اور سکندر ذوالقرنین جیسے کرداروں کو اِس طرح لازوال کر دیا کہ وہ آج تک زندہ ہیں۔ پہلی مثنوی کے آغاز میں نظامی نے اعلان کیا کہ اُن کی شاعری میں درویشی اور بادشاہی دونوں کی روح موجود ہے اور خدا کے رازوں کا خزانہ پیش کیا جارہا ہے:

مایۂ درویشی و شاہی در او مخزنِ اسرارِ الٰہی در او

اُسی زمانے میں دوسرے صوفی مصنفین پہلے سے زیادہ تفصیل کے ساتھ واضح کرنے لگے تھے کہ محبت کی کئی منزلیں ہیں۔ اپنی جان پہچان کے لوگوں سے محبت (جس میں "عشقِ مجازی" بھی شامل ہے)، قوم اور برادری سے محبت، تمام انسانیت سے محبت، تمام جانداروں سے محبت اور پوری کائنات سے محبت (جسے "عشقِ حقیقی" بھی کہا گیا) اصل میں ایک ہی جذبے کی مختلف صورتیں ہیں۔ روزبہان بقلی شیرازی (وفات ۱۲۰۹ء) کی کتاب عُبہرُ العاشقین (عاشقوں کی مہک) میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی۔

اِس طرح یہ مصنفین واضح کر رہے تھے کہ ان کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق تمام قوموں اور پوری انسانیت پر ہوتا ہے:

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اُخوّت کی جہاں گیری، محبّت کی فراوانی[1]

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۳۰۷

دوسری طرف وہ مسلمانوں کو خبردار کر رہے تھے کہ وقت کے سمندر سے جو طوفان اُٹھنے والے ہیں اُن سے بچنے کے لیے ایک اخلاقی قوّت کے ذریعے متحد ہونے کی ضرورت ہے:

بُتانِ رنگ و خُوں کو توڑ کر مِلّت میں گُم ہو جا
نہ تُورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی[1]

باعمل صوفی بھی اِسی لحاظ سے اپنے انداز تبدیل کر رہے تھے۔

اس سے پہلے تصوّف صرف ایک انفرادی حیثیت رکھتا تھا۔ اب باقاعدہ سلسلوں کے تحت منظم ہونے لگا۔ ہر سلسلے میں مرید کسی مرشد کی بیعت کرتے تھے لیکن مرشد کی حیثیت صرف عطار کی کہانی کے ہُدہُد جیسی ہوتی تھی جو باقی پرندوں کو سیمرغ کی تلاش میں نکلنے پر اُکساتا ہے۔ ورنہ ہر سلسلے کا مقصد یہی تھا کہ تمام مرید مل کر ویسی ہی وحدت کو دریافت کریں جیسی عطار نے سیمرغ کی صورت میں پیش کی تھی۔

مذہبی اور سیاسی فرقوں کے برعکس صوفیوں کے سلسلے ایک دُوسرے کے رقیب اور مخالف نہیں بلکہ معاون تھے۔ چار بنیادی سلسلوں میں سے قادریہ سلسلہ بغداد میں عطار کے زمانے سے بھی ذرا پہلے قائم ہو چکا تھا اور اس کے بانی عبدالقادر جیلانی (وفات ۱۱۶۶ء) تھے۔ چشتیہ سلسلہ معین الدین چشتی (وفات ۱۲۳۶ء) نے برصغیر کے شہر اجمیر میں قائم کیا۔ اِس میں موسیقی کو خاص طور پر روحانی سفر کے مراحل طے کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ سہروردیہ سلسلہ شہاب الدین سہروردی (وفات ۱۲۳۴ء) نے ایران میں قائم کیا۔ چوتھا سلسلہ نقشبندیہ تھا جسے اگلی صدی میں بہأالدین نقشبند (وفات ۱۳۸۹ء) نے وسطی ایشیا میں قائم کیا۔ اقبال نے تصوّف کی اِن تمام قسموں کو ”عملی تصوّف“

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۳۰۸

(devotional Sufism) کا نام دے کر اِن کی تعریف کی ہے۔[1]

*

بد قسمتی سے ایک اور قسم کا تصوّف بھی رواج پا رہا تھا، جس میں افلاطون جیسے فلسفیوں کے زیرِ اثر روحانی تجربات کو عمل کی روح سے محروم کیا جا رہا تھا۔ اقبال نے اِسے "مابعد الطبیعاتی تصوّف" کہا ہے۔

اِس تصوّف کی سب سے بڑی شخصیت اندلس سے تعلق رکھنے والے محی الدین ابن عربی (وفات ۱۲۴۰ء) ہیں، جن کے مقام اور مرتبے سے انکار ممکن نہیں ہے کیونکہ ان کے روحانی تجربات نے واقعی انسانی روح کے بہت سے گوشے بے نقاب کیے۔ انہوں نے یہ مفید تصوّر بھی پیش کیا کہ کائنات میں خدا کا وجود پانچ سطحوں پر اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے (جسے "حضراتِ خمسہ") کا نام دیا گیا۔ لیکن فلسفے کے اثر کی وجہ سے ابن عربی اپنے اِن گراں قدر مشاہدات کی کوئی ایسی تشریح پیش کرنے میں ناکام رہے جس سے کوئی عملی نتیجہ برآمد ہو سکتا۔ صوفیوں نے ہمیشہ کہا تھا کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ خدا کی طرف سے (فارسی میں "ہمہ از اُوست") ہے، جسے وحدت الشہود کہتے تھے، لیکن ابن عربی نے ایک دوسرے خیال کو رواج دیا کہ کائنات میں جو کچھ ہے، وہ سب خدا ہی ہے (فارسی میں "ہمہ اُوست")، جسے وحدت الوجود کہا گیا۔

فرقہ وارانہ جھگڑوں اور فضول کے بحث مباحثوں نے مسلمانوں کو پہلے ہی قوّتِ عمل سے محروم کر دیا تھا۔ رہی سہی توانائی افلاطونی تصوّف کے نظریات نے زائل کر دی:

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد   محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

---

[1] Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 91

عجم کے خیالات میں کھو گیا   یہ سالک مقامات میں کھو گیا[1]

*

اُس زمانے میں جو مسلمان حکمراں اپنے زمانے کے عام انتشار پر قابو پا کر اُبھرنے میں کامیاب ہوئے اُن میں سب سے بڑا نام سلطان صلاح الدین ایوبی (عرصۂ حکمرانی ۱۱۷۴ء سے ۱۱۹۳ء) ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہُوا، صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۷۴ء میں مصر میں اپنی حکومت قائم کی تھی۔ آس پاس کی مسلمان بادشاہتوں میں سے کسی کو مصالحت کے ذریعے اپنے ساتھ ملا کر اور کسی کو جنگ میں فتح کر کے اُس نے ایک طاقتور حکومت بنائی، اور ۱۱۸۷ء میں یروشلم فتح کر لیا۔

اٹھاسی برس پہلے جب صلیبیوں نے یروشلم کو فتح کیا تھا تو شہر میں موجود تقریباً ہر مسلمان کو قتل کر دیا تھا لیکن صلاح الدین نے زیادہ تر مسیحیوں کو شہر سے جانے کی اجازت دے دی۔ صلیبیوں نے یروشلم کے یہودیوں کو زندہ جلانے کے بعد اپنے تمام مدتِ حکومت میں یہودیوں کو اِس شہر کی زیارت نہ کرنے دی تھی۔ صلاح الدین نے یہودیوں کو بھی دوبارہ زیارت کرنے اور شہر میں آباد ہونے کی دعوت دی۔

مشرقی آرتھوڈوکس مسیحیوں نے صلیبیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اُس فرقے کے جن بادشاہوں نے مسلمانوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے، مثلاً جارجیا کی خاتون حکمراں تامارِ اعظم (Tamar the Great) جس کا عرصۂ حکمرانی ۱۱۸۴ء سے ۱۲۱۳ء ہے، اُن کے

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۶۸

زائرین کو آزادانہ پرچم لہراتے ہوئے یروشلم میں آنے جانے کی دی گئی۔

یروشلم پر مسلمانوں کا قبضہ بحال کرنے کی وجہ سے صلاح الدین کے خلاف یورپ والوں کے دلوں میں جو نفرت ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے لیکن پھر بھی وہ اُس کی شرافت کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ انگلستان کے بادشاہ رچرڈ شیر دل (Richard the Lionheart) نے، جس کا عرصہ ٔحکمرانی ۱۱۸۹ء سے ۱۱۹۹ء ہے، یروشلم کو واپس حاصل کرنے کی۔ وہ اپنی اِس کوشش میں ناکام رہا لیکن اُس کی مہم نے ایسے افسانوں کو جنم دیا جو آج بھی زندہ ہیں۔ اُن میں صلاح الدین اور رچرڈ کی باہمی دشمنی کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک کے قصے، اور خود انگلستان میں رابن ہُڈ کے نیم افسانوی کردار کے معرکے خاص طور پر مشہور ہیں۔

افغانستان میں ۱۱۶۳ء سے غزنوی خاندان کی جگہ غوری خاندان کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اِس خاندان سے تعلق رکھنے والے سلطان شہاب الدین محمد غوری (عرصہ ٔحکمرانی ۱۱۷۳ء سے ۱۲۰۶ء) نے، جسے معزالدین محمد بن سام بھی کہا جاتا ہے، ۱۱۸۲ء تک موجودہ پاکستان کے اکثر علاقے اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔

اُس کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے راجپوت سرداروں نے اجمیر کے حکمران پرتھوی راج چوہان (عرصہ ٔحکمرانی ۱۱۷۷ء سے ۱۱۹۲ء) کی قیادت میں متحد ہو کر ۱۱۹۱ء میں ترائن کے مقام پر، جو موجودہ بھارت کی ریاست ہریانہ میں ہے، غوری کو شکست دی۔

اگلے برس غوری نے زیادہ تیاری کے ساتھ واپس آ کر اُسی مقام پر پرتھوی راج کو شکست دی اور آگے بڑھ کر دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اُس کے سالاروں نے جلد ہی شمالی ہندوستان میں بنگال کے بعض علاقوں تک مسلمان حکومت قائم کر دی۔

۱۲۰۶ء میں غوری موجودہ پاکستان میں جہلم کے قریب ایک دشمن کے ہاتھوں قتل ہو

گیا تو اُس کے امیروں نے اِن تمام علاقوں کو غوری سلطنت سے علیحدہ کر کے غوری کے ترک غلام قطب الدین ایبک کو یہاں کا بادشاہ بنا دیا۔ اِس طرح اُس حکومت کی بنیاد پڑی جسے سلطنتِ دہلی کہا جاتا ہے اور جو برصغیر میں موجودہ پاکستان کی سرحدوں سے باہر مسلمانوں کی پہلی حکومت تھی۔

قطب الدین ایبک اپنی فیاضی کی وجہ سے ہندوستان میں کئی صدیوں تک حاتم کی طرح مشہور رہا کہ کسی کی سخاوت بیان کرنے کے لیے کہا جاتا تھا کہ وہ اپنے وقت کا ایبک ہے۔ ۱۲۰۶ء سے ۱۲۹۰ء تک دہلی کی سلطنت پر اِس خاندان کے غلاموں یا اُن کی اولادوں کی حکومت رہی اِس لیے اِسے خاندانِ غلاماں کہا گیا ہے۔ سلطان رضیہ (عرصۂ حکمرانی ۱۲۳۶ء سے ۱۲۴۰ء)، جو اسلامی تاریخ میں ایک باصلاحیت خاتون بادشاہ ہونے کی وجہ سے مشہور ہے، ایبک ہی کی نواسی تھی۔ یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ کچھ ہی عرصے بعد مصر میں بھی غلاموں کا ایک خاندان اقتدار میں آیا جسے مملوک (عرصۂ حکمرانی ۱۲۵۰ء سے ۱۵۱۷ء) کہا جاتا ہے اور وہاں بھی ایک عورت، سلطان شجرۃ الدُّر (عرصہء حکمرانی ۱۲۵۰ء سے ۱۲۵۷ء) نے حکومت کی بلکہ اُس خاندان کی اصل بانی بھی وہی تھی۔

*

دنیائے اسلام سے باہر بھی بعض ریاستوں میں ایسی تبدیلیاں آرہی تھیں جن کی بدولت اُن ریاستوں کا نظمِ حکومت زیادہ مضبوط بنیادوں پر اُستوار ہو رہا تھا۔

۱۲۱۵ء میں انگلستان کے جاگیرداروں نے بادشاہ جان (King John) کو اُس دستاویز پر دستخط کرنے پر مجبور کر دیا جو میگنا کارٹا (Magna Carta) کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اِس کا مقصد صرف بادشاہ کے مقابلے میں جاگیرداروں کے حقوق کو تحفظ دینا تھا

لیکن بہر حال اِس کے ذریعے یہ اصول طے ہو گیا کہ بادشاہ بھی کسی قانون کا پابند اور بعض معاملات میں کسی نہ کسی سے مشورہ کرنے پر مجبور ہے۔ گزرتی ہوئی صدیوں کے ساتھ ساتھ اِنہی حقوق کا دائرہ وسیع ہوتا رہا ہے یہاں تک کہ یہی میگنا کارٹا آج بھی برطانیہ کی دستوری حکومت کی بنیاد ہے۔ چونکہ دنیا کے اکثر جمہوری نظام برطانوی حکومت ہی کے زیرِ اثر وجود میں آئے ہیں (جن میں پاکستان کا نظامِ حکومت بھی شامل ہے)، اِس لیے میگنا کارٹا اُن سب کی بنیاد بھی قرار پاتا ہے۔

ہسپانیہ (اسپین اور پرتگال) کی بعض مسیحی ریاستوں میں پارلمانی اسمبلیاں قائم ہو رہی تھیں، جن کا آغاز ۱۱۸۸ء میں لیون (León) سے ہُوا اور جلد ہی بعض دوسری ریاستوں میں یہ رواج شروع ہو گیا۔

افریقہ کے پراسرار قلب میں، موجودہ ریاست مالی کے علاقے کے فرمانروا سوندیاتا کیتا (Sundiata Keita) نے ۱۲۳۵ء کے قریب زبانی طور پر ایک آئینی منشور جاری کیا جسے کورکن فوگا (Kouroukan Fouga) کہا جاتا ہے، اور جو صدیوں تک مغربی افریقہ میں اُسی طرح کی اہمیت کا حامل رہا جیسی برطانیہ میں میگنا کارٹا کو حاصل ہے۔

کئی سمندر پار جاپان میں بھی ۱۲۲۱ء میں ریاست کے بہت سے اختیارات مطلق العنان شہنشاہ کے ہاتھوں سے نکل کر فوجی امرا کے پاس آ گئے جنہیں شوگن (shogun) کہا جاتا تھا اور یہ بندوبست ۱۸۸۶ء تک برقرار رہا۔

تاہم اِس سلسلے کی وہ پیشرفت جو بہت جلد دنیا کو ہلا کر رکھ دینے والی تھی، تہذیب و تمدن کے گہواروں سے دُور چین کے شمال میں واقع موجودہ منگولیا کے صحرائے گوبی کے ویرانوں میں ہو رہی تھی جہاں آسمان کی پرستش کرنے والے منگول اور تاتاری قبائل

رہتے تھے۔[1] ایک منگول قبیلے کے سردار تموجن نے باقی منگولوں پر بھی بالادستی قائم کی اور تاتاریوں کو بھی شکست دے کر مطیع کر لیا جس کے بعد ۱۲۰۶ء میں قبائل کی اسمبلی، قرولتائی، نے اُسے تمام قبائل کا حکمراں تسلیم کر کے چنگیز خاں کا لقب دے دیا جس کا مطلب ''دنیا کا بادشاہ'' تھا۔

چنگیز خاں نے جلد ہی اپنے قبائل کے ساتھ دیوارِ چین عبور کر کے شمالی چین پر قبضہ کیا اور ایک وسیع سلطنت کی بنیاد رکھی جو آگے چل کر اِنسانی تاریخ کی سب سے بڑی متصل زمینی سلطنت بننے والی تھی۔ اُس نے اپنی حکومت کا بندوبست کرنے کے لیے قوانین کا ایک مجموعہ نافذ کیا جسے یاسا (Yassa) کہا گیا ہے۔ اِن قوانین میں دُوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری شامل تھی اِس لیے چنگیز خاں نے چین میں پہلے سے آباد مسلمانوں کے ساتھ عموماً اچھا سلوک کیا۔ قریب کی خوارزم شاہی مسلمان سلطنت کے ساتھ بھی شروع میں اُس کے تعلقات اچھے ہی تھے۔ یہ وسیع سلطنت، جو ۱۱۹۸ء سے ۱۲۳۱ء تک قائم رہی، ایران اور وسطی ایشیا کے بہت سے حصوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

جس واقعے سے خوارزم اور چنگیز خاں کے تعلقات خراب ہوئے، اُس کے بارے میں کئی ملتی جلتی روایات موجود ہیں لیکن خلاصہ یہی ہے کہ ۱۲۱۸ء میں خوارزم کے ایک سرحدی گورنر نے منگول تاجروں کو جاسوسی کے الزام میں قتل کیا اور جب چنگیز نے اِس سلسلے میں اپنے سفیر سلطان علاؤالدین محمد خوارزم شاہ کے پاس بھیجے تو خوارزم شاہ نے سفیروں کو بھی قتل کر دیا۔ اگلے برس یعنی ۱۲۱۹ء میں چنگیز خاں نے خوارزم پر حملہ کر دیا

[1] منگول اور تاتاری دو علیحدہ نسلوں کے نام تھے اگرچہ بعد میں مسلم دنیا پر اُن کے حملے کے تذکروں میں انہیں مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا اور اُن کی لشکر کشی کو کبھی منگولوں کا حملہ اور کبھی تاتاریوں کی یلغار کہا گیا۔

اور تاریخ نے وہ ناقابلِ یقین مناظر دیکھے جن کی وجہ سے مسلم تہذیب میں آج بھی ''چنگیزیت'' کا لفظ ظلم اور بربریت کے انتہائی درجے کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

سمرقند، بخارا اور خوارزم کے دارالحکومت جرجانیہ جیسے شہر اِس طرح تباہ کیے گئے کہ مَردوں، عورتوں اور بچوں کو نہایت اذیتناک طریقے سے ہلاک کیا گیا۔ فتح کی نشانی کے طور پر اِنسانی سروں کے مینار تعمیر کیے گئے۔ مسلمانوں نے منگولوں اور تاتاریوں کو یاجوج اور ماجوج قرار دے کر سمجھا کہ قیامت کے آثار نمودار ہو گئے ہیں۔

ایک ڈیڑھ برس میں ہی سلطان بحیرۂ خضر (Caspian Sea) کے ایک جزیرے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ اُس کا بیٹا سلطان جلال الدین محمد خوارزم شاہ (عرصۂ حکمرانی ۱۲۲۰ء سے ۱۲۳۱ء)، جسے منکبرنی بھی کہتے ہیں، لُٹی ہوئی سلطنت پر حکمراں ہُوا۔ اُس نے اپنی بچی کھچی فوج کے ساتھ منگولوں کو ایسی عبرت ناک شکست دی کہ چنگیز، جو معاملات اپنے سرداروں کے سپرد کر کے واپس جاچکا تھا، پلٹ کر آنے پر مجبور ہُوا۔

اِدھر مالِ غنیمت کی تقسیم پر جھگڑے کی وجہ سے جلال الدین کے آدھے سپاہی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ ۱۲۲۱ء میں موجودہ پاکستان میں اٹک کے مقام پر دریائے سندھ اور دریائے کابل کے سنگم کے قریب جنگِ کنارۂ سندھ (The Battle of Indus) میں چنگیز نے خوارزم کی بکھری ہوئی فوج کو شکست دے کر تقریباً ختم کر دیا لیکن جلال الدین اپنے گھوڑے سمیت ایک پہاڑی سے دریا میں کود کر فرار ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ چنگیز نے اُس کی بہادری سے متاثر ہو کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ کوئی اُس پر تیر نہ چلائے اور اپنے بیٹوں کو مخاطب کر کے کہا، ''خوش نصیب ہے وہ باپ جس کا ایسا بیٹا ہو!'' یہ جنگ خوارزم کی شکست کی تکمیل سمجھی جاتی ہے جس کے بعد چنگیز واپس چلا گیا اور ۱۲۲۷ء میں فوت ہو گیا (منگولیا اور مشرقِ بعید کے بہت سے ممالک میں وہ آج بھی ایک قومی ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے)۔

دُوسری طرف تاتاریوں کی یلغار خوارزم کے بقیہ علاقے کو، جس میں وسطی ایشیا اور ایران کے اکثر شہر شامل تھے، برباد کرتی ہوئی مشرقی یورپ کے سرحدی ممالک تک جا پہنچی۔

خوارزم شاہ تاج و تخت سے محروم ہونے کے بعد بھی ایک آخری چٹان کی طرح اِس یلغار کے سامنے ڈٹا رہا۔ پنجاب میں ایک جلاوطن حکومت قائم کر کے دو ڈھائی سال تک یہاں رہا۔ پھر وسطی ایشیا اور ایران کے مختلف حصوں میں بھٹکتا پھرا، اور حملہ آوروں کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنے کے لیے مسلمان حکمرانوں کے علاوہ مشرقی آرتھوڈوکس مسیحیوں کو بھی دعوت دیتا رہا:

کبھی دریا سے مثلِ موج اُبھر کر — کبھی دریا کے سینے میں اُتر کر
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر — مقام اپنی خودی کا فاش تر کر![1]

جلال الدین کی تمام کوششیں بیکار ہوئیں۔ ۱۲۳۱ء تک وہ تاریخ کے منظرنامے سے غائب ہو گیا۔ بعض راویوں کے مطابق وہ ایک معرکے میں شہید ہُوا، بعض کے مطابق برفانی طوفان میں جنگلوں کی طرف نکل گیا اور بعض کچھ اور کہتے ہیں۔

بہر حال منگول سلطنت چین کے علاوہ ایران، روس، ہندوستان اور مشرقی یورپ کے کئی حصوں تک پھیل گئی۔ چھوٹے چھوٹے مسلمان اور مسیحی حکمراں جو منگولوں کے مقابلے پر متحد ہو کر ''سیمرغ'' نہ بن سکے تھے، منگولوں کے مطیع ہوتے چلے گئے۔

۱۲۵۸ء میں چنگیز کے پوتے ہلاکو خاں نے بغداد پر حملہ کیا۔ منگولوں کی مذہبی رواداری صرف اِس حد تک تھی کہ رعایا کو اُس کے مذہب پر قائم رہنے دیتے تھے۔ اسلام کو ایک ہم پلّہ سیاسی قوّت کے طور پر برداشت کرنا اُن کے بس سے باہر تھا۔ بغداد پر حملے

---

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۵۵

سے اُن کا مقصد صرف ایک شہر کو فتح کرنا نہیں بلکہ اسلام کے سیاسی اور تہذیبی وجود کو فنا کرنا تھا۔ لیکن جن مسلم حکمرانوں نے منگولوں کی اطاعت قبول کی تھی وہ اب بھی منگولوں کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ چنانچہ ہلاکو خاں کے لشکر میں وسطی ایشیا اور ایران کے مسلمانوں کے کئی جتھے اور بعض نامور مسلم اہلِ علم شامل تھے جبکہ صلاح الدین ایوبی کا پوتا، جو الناصر یوسف کے لقب کے ساتھ بغداد کی سرحدوں سے متصل علاقوں میں سب سے طاقتور حکمران تھا، سلامتی کی چادر میں منہ چھپائے اپنے گھر میں بیٹھا تھا۔

ایک مختصر محاصرے کے بعد ہلاکو کے سپاہی شہر میں داخل ہو گئے۔ اُس لشکر میں شامل مسلمان اہلِ علم اور مؤرخ نصیر الدین طُوسی سے منسوب کیا گیا ہے کہ ہلاکو نے ایک سنہری طشت میں ہیرے جواہرات خلیفہ مستعصم کے سامنے رکھ کر کہا، ”کھاؤ۔“ خلیفہ نے جواب دیا، ”یہ کھائے نہیں جاسکتے۔“ ہلاکو نے کہا، ”تب تم نے اِنہیں جمع کیوں کیا اور اِنہیں لشکر تیار کرنے پر کیوں نہ صرف کیا؟ اپنے محل کے دروازوں کے لوہے کو تیروں میں ڈھلوا کر دریا پر کیوں نہ آئے کہ میں اُسے عبور نہ کر سکتا؟“ خلیفہ نے کہا، ”خدا کی مرضی یہی تھی۔“ ہلاکو نے جواب دیا، ”اب تمہارے ساتھ جو ہونے والا ہے، وہ بھی خدا کی مرضی ہے۔“

خلیفہ کو قالین میں لپیٹ کر منگول شہسواروں کے گھوڑوں کے سُموں تلے روند ڈالا گیا۔ کچھ ایسے شہریوں کو علیحدہ کیا گیا جو منگولوں کے کام آسکتے تھے، جیسے انجینئر وغیرہ۔ ہلاکو کی بیوی مشرقی آرتھوڈوکس مسیحیت سے تعلق رکھتی تھی اِس لیے اُس مذہب کے شہری بھی بخش دیئے گئے۔ باقی تمام شہریوں کو ویسی ہی بیدردی کے ساتھ قتل کیا گیا جس کے لیے منگول اور تاتاری مشہور تھے۔ ہلاکو کے اپنے بیان کے مطابق مقتولین کی تعداد دو لاکھ اور دُوسروں کے مطابق کئی گنا زیادہ تھی۔ بغداد کے وہ محلات، کتب خانے اور

عمارات جن کا جواب دنیا میں نہ تھا، جلا کر راکھ کر دیئے گئے۔

مسلم موٴرخین نے اِس تباہی کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دریائے دجلہ کا پانی کتابوں کی سیاہی سے سیاہ اور انسانی لہو سے سرخ ہو گیا۔ پانچ صدیوں تک اسلامی تہذیب کا مرکز رہنے والا شہر اپنی تمام تاریخی دستاویزات، یادگاروں اور شہریوں کے ساتھ ماضی کا افسانہ بن گیا۔ ایک قیامت آکر گزر گئی لیکن وہ دجلہ جس کی لہریں کبھی علم کی روشنیوں سے جھلماتی تھیں، ایک عہد کی خاموش لاش اُٹھائے بدستور بہتا رہا۔

باب ۲

طاقت کے سرچشمے

کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اِتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسّم ہائے پنہانی[1]

*

بغداد کی تباہی کے بعد ہلاکو خاں کا ارادہ تھا کہ سب سے پہلے شام اور مصر فتح کیے جائیں۔ چونکہ منگولوں اور تاتاریوں کا مقصد اسلام کی قوّت کو زائل کرنا تھا اِس لیے سمجھا گیا ہے کہ وہ مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کی نیت بھی رکھتے ہوں گے۔

دُوسری طرف چنگیز خاں کا ایک اور پوتا برکہ خاں ۱۲۵۲ء کے قریب وسطی ایشیا میں اسلام قبول کر چکا تھا۔ بغداد کی تباہی نے اُسے ہلا کر رکھ دیا۔ اسلام کی حفاظت کے لیے اُس نے مصر کے مملوک خاندان کے ساتھ فوجی اتحاد قائم کیا۔

مملوک حکمراں نے اپنے سپہ سالار رکن الدین بیبرس کی قیادت میں ۱۲۶۰ء میں فلسطین کے علاقے میں عین جالوت کے مقام پر منگول لشکر کو شکست دے دی (جس کے چند ہفتے بعد بیبرس مصر کا حکمراں بنا اور ۱۲۷۷ء تک حکومت کی)۔ ہلاکو خاں نے غضب ناک ہو کر واپس آنا چاہا تو برکہ خاں نے اُس کے خلاف بغاوت کر کے اُس کے بڑھتے

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۷۹

ہوئے قدم روک دیئے:

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے[1]

*

۱۲۷۱ء تک منگول مقبوضہ جات چار سلطنتوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔[2] اُن میں سب سے زیادہ طاقتور منگولیا اور چین کی سلطنت تھی جس پر قبلائی خاں (عرصۂ حکمرانی ۱۲۶۰ء سے ۱۲۹۴ء) حکومت کر رہا تھا۔ اُس نے چین کے مزید علاقے فتح کر کے داڈُو (موجودہ بیجنگ) کو دارالحکومت بنایا اور یُو آن خاندان (عرصۂ حکمرانی ۱۲۷۱ء سے ۱۳۶۸ء) کی بنیاد رکھی۔

قبلائی خاں نے طاقت کے ایک نئے نظام کو جنم دیا اور اگلے پانچ سو برس تک دنیا کی ہر بڑی سلطنت میں اُسی کے عکس دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض قبلائی خاں کے براہِ راست اثر کی وجہ سے تھے اور بعض انسانیت کے ضمیر نے خود ہی دریافت کیے ہوں گے۔

چین میں کنفیوشس کی تعلیمات سے جو انتظامی ڈھانچہ اخذ کیا گیا تھا اُسے قبلائی خاں نے قبول کر کے اُس میں نسلی درجہ بندی کا اضافہ کر دیا جس میں منگول سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ انتظامیہ میں ایرانیوں، وسطی ایشیا سے تعلق رکھنے والوں اور مسلمانوں کو ترجیح دی گئی جو قدرتی طور پر مقامی چینی آبادی سے علیحدہ تھے اور مرکزی منگول قوّت کے

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۲۳۰

[2] ایران پر ایلخانی (۱۲۲۶ء سے ۱۳۳۵)، روس اور قپچاق پر طلائی (اندازاً ۱۲۴۰ء سے ۱۵۰۲ء)، وسطی ایشیا پر چغتائی (۱۲۲۷ء سے اندازاً ۱۷۰۰ء) اور منگولیا اور چین پر یُو آن (۱۲۷۱ء سے ۱۳۶۸ء) حکومتیں قائم ہوئیں۔

وفادار رہنے پر مجبور تھے۔

صوبوں کے گورنر، ٹیکس جمع کرنے والے افسران اور فوجی سردار سب براہِ راست شہنشاہ کے دربار کو جوابدہ تھے۔ اس کے علاوہ پیغام رسانی کا ایک انتہائی تیز رفتار نظام متعارف کروایا گیا جس کے تحت شاہی فرمان ایک ہی دن میں ہزاروں کلومیٹرز کے فاصلے پر پہنچ سکتے تھے۔ اُس زمانے میں جبکہ پیغامات صرف گھڑسوار ہرکاروں کے ذریعے ہی بھیجے جاسکتے تھے، یہ نظام بہت حیرت انگیز تھا۔ رعایا کو شہنشاہ کا اثر محسوس کروانے کے لیے زبان، ادب اور فنونِ لطیفہ سے بھی کام لیا گیا۔

قبلائی خاں کے زمانے میں یورپی تاجر مارکو پولو چین آیا تو وہاں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُس کے سفرنامے کے ذریعے، جو ۱۳۰۰ء کے لگ بھگ شائع ہوا، قبلائی خاں یورپ کے لیے ایک افسانوی ہیرو بن گیا اور وہاں کے ادب میں اُس کی بازگشت صدیوں تک سنائی دیتی رہی:

In Xanadu did Kubla Khan
A stately pleasure-dome decree:
Where Alph, the sacred river, ran
Through caverns measureless to man
Down to a sunless sea.[1]

رقصِ درویش

چین سے باہر کی دنیا استحکام سے محروم تھی اور مسلمانوں کا حال سب سے برا تھا۔ فارسی زبان کے جن شاعروں نے اُس تہذیب کے لیے نئی زندگی کے سامان فراہم کرنے کی

[1] یہ انگریز شاعر کولرج (Coleridge) کی مشہور نظم قبلا خاں (‘Kubla Khan’) کی ابتدائی سطور ہیں۔

کوشش کی اُن میں جلال الدین رومی (۱۲۰۷ء سے ۱۲۷۳ء)، مصلح الدین سعدی شیرازی (اندازاً ۱۲۱۰ء سے ۱۲۹۲ء) اور محمود شبستری (۱۲۸۸ء سے ۱۳۴۰ء) سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

جلال الدین افغانستان کے شہر بلخ میں پیدا ہوئے لیکن اُنہوں نے موجودہ ترکی کے شہر قونیہ میں سکونت اختیار کی، جو اُس وقت رومی سلجوقی سلطنت کا دارالحکومت تھا اِس لیے یہ رومی اور مولانا روم کہلائے۔ ان کی شعری تصانیف دیوانِ شمس تبریز اور مثنوی معنوی ہیں۔ ان میں سے دوسری تصنیف ذہنی اور روحانی تربیت کا ایک مکمل نصاب ہے جس میں حکایات سے بھرپور کام لیا گیا ہے۔ اپنے زمانے میں اُنہوں نے بانسری، موسیقی اور اُس مخصوص طرز کے رقص سے بھی کام لیا جسے "رقصِ درویش" کہا گیا ہے:

ہم خُوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اک بحرِ پُر آشوب و پُراسرار ہے رومیؔ
تُو بھی ہے اُسی قافلۂ شوق میں اقبالؔ
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؔ[1]

شیخ سعدی شیرازی نے اپنی تصانیف گلستان اور بوستان میں یہی کام کیا لیکن صرف عملی اور بنیادی باتوں تک محدود رہے۔ چنانچہ اُن کی دونوں تصانیف فوراً ہی بچوں کے نصاب میں شامل ہو گئیں۔ صدیوں تک مسلم دنیا کے فارسی بولنے والے ممالک میں قرآن کے بعد گلستان پہلی کتاب ہوتی تھی جسے بچے چھوٹی عمر سے پڑھنا شروع کرتے تھے۔ اُسی میں وہ مشہور شعر بھی شامل تھا جسے اب اقوامِ متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں آویزاں کیا گیا ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے کے اعضا کی طرح ہیں کیونکہ سب کی اصل ایک ہے:

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۲۰۰

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند   کہ در آفرینش زیک گوہر اند

محمود شبستری کا تعلق موجودہ ایران میں تبریز کے قریب شبستر سے تھا۔ اُن کی سب سے مشہور تصنیف گلشنِ راز ہے جس میں تصوّف کے بعض بنیادی سوالوں کے جواب اِس طرح دیئے گئے کہ روحانی علوم آسانی سے سمجھ میں آ جائیں اور اُس زمانے کی عملی زندگی میں کارآمد ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۷ء میں علامہ اقبال نے نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اِس کتاب کے موضوعات کو دوبارہ لکھ کر گلشنِ راز جدید کے عنوان سے پیش کیا۔ اُنہوں نے اُس کے شروع میں لکھا، "میں نے مطلب کی بات ایک اور طرح سے کہہ کر محمود شبستری کی کتاب کا جواب لکھا ہے کیونکہ اُن کے زمانے سے لے کر آج تک کسی نے ہمارے دل میں ایسی آگ نہیں بھڑکائی ہے۔ تبریز کے اُس دانا کے سامنے وہ قیامتیں گزریں جو چنگیز خاں کی کھیتی سے اُٹھی تھیں۔ مگر میری نظر نے ایک اور انقلاب دیکھا اور کسی دُوسرے سورج کو اُبھرتے پایا":

بہ طرزِ دیگر از مقصود گفتم   جوابِ نامۂ محمود گفتم
ز عہدِ شیخ تا ایں روزگارے   نَزد مَردے بجانِ ما شرارے
گذشت از پیش آں دانائے تبریز   قیامتہا کہ رُست از کشتِ چنگیز
نگاہم انقلابے دیگرے دِید   طلوعِ آفتابے دیگرے دِید[1]

اُن صوفیوں کا شمار کرنا مشکل ہے جنہوں نے بکھری ہوئی دنیا کو پھر سے سمیٹنے کے لیے اِن پیغامات کو اِسلامی دنیا اور بالخصوص برصغیر کے کونے کونے تک پہنچا دیا اور عوام کے نچلے سے نچلے طبقے کو بھی متاثر کیا۔

---

[1] اقبال، زبورِ عجم، ص ۲۰۴-۲۰۳

فرید الدین مسعود (وفات ۱۲۶۵ء) پاک پتن میں آباد ہوئے اور گنج شکر کہلاتے ہیں۔ شیخ عثمان مروندی (وفات ۱۲۷۴ء) افغانستان یا ایران سے آ کر سندھ کے شہر سہون میں آباد ہوئے اور لعل شہباز قلندر کہلائے۔

نظام الدین اولیاؒ (۱۳۲۵ء) کی خانقاہ دہلی میں تھی۔ وہ محبوبِ الٰہی اور سلطان المشائخ کہلاتے ہیں:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری، فیض عام ہے تیرا[1]

اُن سے والہانہ عقیدت رکھنے والے اُن کے مرید امیر خسرو (۱۳۲۵ء) فارسی کے عظیم شاعر ہونے کے علاوہ اُس زبان کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں جسے اب اُردو کہا جاتا ہے۔ ایک موسیقار اور فنکار کی حیثیت میں امیر خسرو نے برصغیر میں وہی کام کیا جو زِریاب نے اندلس میں کیا تھا کہ ایک نئی سرزمین میں اُبھرتی ہوئی اسلامی تہذیب کو موسیقی، زبان اور طرزِ معاشرت کے ذریعے ایک سانچے میں ڈھال دیا:

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو[2]

دُوسری طرف ایک اور طرح کی صوفی شاعری بھی مقبول ہونے لگی جس میں عمل کے بجائے ایک بے نیاز اور وجد آمیز کیفیت میں مصائب کا مداوا تلاش کیا گیا۔ فارسی میں حافظ شیرازی (وفات ۱۳۹۰ء) اِس فن کے سب سے بڑے ماہر کے طور پر سامنے آئے جن کے سحر کا اعتراف سب کو کرنا پڑا ہے:

---

[1] اقبال، ’التجائے مسافر‘، بانگِ درا، ص ۹۷

[2] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۰۷

آؤ، پھول بکھیریں اور مئے کو ساغر میں ڈالیں! نیلی چھتری کو چیر کر ایک نیا نقشہ بنائیں!
اگر غم ایک لشکر کے ساتھ آئے اور عاشقوں کا خون بہائے تو مَیں اور ساقی ساتھ ساتھ آگے بڑھیں اور اُس کی بنیاد کو گرا دیں۔
جب ہاتھ میں خوش آواز ساز ہے تو اے موسیقار! کوئی خوبصورت نغمہ چھیڑ دے تا کہ ہم ہاتھوں کو لہرا کر غزل گائیں اور پاؤں سے زمین پر تھاپ دیں۔
شیراز میں اب نہ فصاحت رہی ہے نہ خوش آوازی! آؤ حافظ کہ ہم خود کو کسی اور سرزمین میں لے چلیں!

بیا تا گل بر افشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحے نَو دَراندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہ ہم تازیم و بنیادش براندازیم
چو در دست است رودے خوش، بزن مطرب سرودے خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم
سخندانی و خوشخوانی نمی ورزند در شیراز
بیا حافظ کہ تا خود را بہ مُلکے دیگر اندازیم

مذہبی فکر میں اُس زمانے کی ایک متنازعہ شخصیت ابن تیمیہ (وفات ۱۳۲۸ء) تھے، جنھوں نے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہوئے پچھلے مکاتیبِ فکر میں سے بیشتر کو گمراہ اور تصوّف کو بدعت کہا، اور برکہ خاں جیسے منگولوں کی حکومت کو بھی ناجائز قرار دے دیا کیونکہ مسلمان ہونے کے باوجود وہ شریعت کے پابند نہ تھے۔ لیکن اِس انتہاپسندی نے تازہ اجتہاد کے لیے ایک بنیاد ضرور فراہم کر دی جس سے آیندہ کچھ کام لیا

جاسکتا تھا۔

اُس زمانے کی ایک اور مذہبی شخصیت جس کا نام کئی تہذیبوں میں مشہور ہو چکا ہے، مراکشی عالم ابن بطوطہ (وفات ۱۳۶۹) ہے، جس نے اسلامی دنیا کے اکثر ممالک کا سفر کر کے ۱۳۵۰ء کے قریب رحلۃ کے عنوان سے سفر نامہ لکھا۔

*

دنیائے اسلام سے باہر جو بڑے شاعر اُسی زمانے میں اپنے اپنے معاشروں کے باطن کی تشکیل کر رہے تھے اُن میں اطالوی شاعر دانتے (Dante Alighieri) سب سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ اُس کی کتاب ڈیوائن کامیڈی میں، جو اُس کے سالِ وفات ۱۳۲۱ء میں مکمل ہوئی، مسیحی نقطۂ نظر سے برزخ، جہنم اور جنت کا ایک تخیلاتی سفر نامہ پیش کیا گیا۔

اطالوی زبان ہی کے شاعر پیٹرارک (Francis Petrarch) نے، جو ۱۳۷۴ء میں فوت ہُوا، اپنی شاعری کے ذریعے یہ احساس پیدا کیا کہ دنیاوی جدوجہد، عقل اور عام انسانی جذبات کے ذریعے بھی خدا تک پہنچا جاسکتا ہے۔

انگلستان میں، جہاں پرانی انگریزی کی جگہ اب درمیانی دَور کی انگریزی (Middle English) رواج پارہی تھی، جیوفرے چاسر (Geoffrey Chaucer) نے یہی احساس پیدا کرنے کے لیے کہانیوں سے کام لیا جس کا مجموعہ کانٹربری ٹیلز (*The Canterbury Tales*) ۱۴۰۰ء میں اُس کی وفات کے ساتھ نامکمل رہ جانے کے باوجود کئی لحاظ سے اپنی قوم کے معاشرتی شعور کی ایک مشترکہ بنیاد بن گیا۔

*

اُس زمانے میں بیشتر خطوں میں کوئی بادشاہ دیرپا اثرات قائم کرنے میں کامیاب ہوتا

دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سلطنتِ دہلی میں تُرکوں کے مختلف خاندان چار چار دن کی بہار دکھا کر گزرتے رہے۔ خاندانِ غلاماں (۱۲۰۶ء سے ۱۲۹۰ء) کے سب سے زیادہ پر شکوہ بادشاہ سلطان غیاث الدین بلبن (عرصۂ حکمرانی ۱۲۶۶ء سے ۱۲۸۷ء) کے بعد خانہ جنگی جیسے حالات پیدا ہوئے تو خلجی خاندان (۱۲۹۰ء سے ۱۳۲۰ء) اقتدار میں آیا جس میں سے صرف علأالدین خلجی (عرصۂ حکمرانی ۱۲۹۶ء سے ۱۳۱۶ء) ہی صحیح معنوں میں ایک طاقتور بادشاہ ثابت ہو سکا۔ دکن کے بعض علاقے فتح کرنے کے علاوہ اُس نے انتظامِ سلطنت کے لیے بھی زبردست بندوبست کیا لیکن اُس کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ انتظامی ڈھانچہ ریت کے گھروندے کی طرح بکھرا اور تغلق خاندان (۱۳۲۰ء سے ۱۴۱۳ء) برسرِ اقتدار آیا۔ آیندہ نسلوں نے اُس خاندان کے محمد بن تغلق کو سب سے زیادہ یاد رکھا ہے لیکن اِس شہرت کی وجہ کتابی علم پر مبنی وہ انتظامی تجربات تھے جن کے نتائج توقع کے برعکس نکلے اور عوام اُس بادشاہ کو "پڑھا لکھا جاہل" کہنے لگے:

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قُدرت بھی ہے لذّت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سُراغ!
اہلِ دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ![1]

ان بادشاہوں کی ہمیشہ رہنے والی نشانیوں میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر وہ طرزِ تعمیر میں ہے

[1] اقبال، 'تربیت'، ضربِ کلیم، ص۷۸

جس میں مقامی ہندو روایات اسلامی طرز کے ساتھ مل کر ایک عجیب قوت، سادگی اور دوام کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ اِس کا آغاز قطب الدین ایبک کی بنائی مساجد اور قطب مینار دہلی کے ساتھ ہو چکا تھا لیکن اِس کا سب سے مکمل نمونہ ملتان میں واقع وہ مقبرہ سمجھا جاتا ہے جسے تغلق خاندان کے بانی غیاث الدین نے ۱۳۲۰ء کے لگ بھگ تعمیر کروایا تھا اور جسے بعد میں صوفی شاہ رکن عالم (وفات ۱۳۳۵ء) کی تدفین کے لیے استعمال کیا گیا۔

۱۳۴۷ء میں دکن بہمنی خاندان کے تحت ایک علیحدہ مسلم ریاست بن گیا جو ۱۵۲۷ء تک قائم رہی۔ جبکہ ہندو ریاستوں میں وجے نگر (۱۳۳۶ء سے ۱۶۴۶ء) سب سے نمایاں تھی جو دکن سے نیچے کے بیشتر علاقے پر مشتمل تھی۔

لیکن ان بڑی ریاستوں کے علاوہ سینکڑوں اور بھی تھیں جن میں سے بعض کے مٹے مٹے نقوش تاریخ سے زیادہ افسانوں کے جگہ پاتے ہیں۔ سندھ کے سومرو خاندان (۱۰۲۶ء سے ۱۳۵۱ء) کے عمر سومرو اور سمّہ خاندان (۱۳۵۱ء سے ۱۵۲۲ء) کے جام تماچی کے وجود تاریخی وجود نہیں ملتے لیکن اُن میں سے پہلا اُس کہانی کی وجہ سے مشہور ہے جس میں اُسے ایک غریب لڑکی ماروی کی خودداری کے مقابلے میں شکست نصیب ہوتی ہے اور دُوسرا اُس کہانی کی وجہ سے زندہ ہے جس کے مطابق اُس نے ایک غریب مچھیرن نُوری کو ملکہ بنا کر اُونچے نسب کی عورتوں پر ترجیح دی۔

*

بقیہ دنیا کے سیاسی انتشار میں جگہ جگہ ایسے کردار اُبھر رہے تھے جن کی افسانوی شہرت اُن کی تاریخی حیثیت پر غالب آنے والی تھی۔ مثلاً ۱۳۲۴ء میں افریقی بادشاہ منسیٰ موسیٰ کا سفرِ حج اِس لیے مشہور ہُوا کہ حجاز میں مغربی افریقہ کی دولت اور وقار کے جلوے دیکھے گئے۔

موجودہ ترکی کے علاقے میں رومی سلجوقوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور چھوٹے چھوٹے قبائلی سرداروں کی حکمرانی تھی۔ اُن میں سے ایک نے، جس کا نام عثمان تھا، ۱۲۹۹ء میں وہ سلطنت قائم کی جسے اُس کے نام پر عثمانی سلطنت (۱۲۹۹ء سے ۱۹۲۲ء) کہا گیا ہے۔ یہ خاندان اسلامی تاریخ کا سب سے طویل عرصے (مسلسل ۶۲۳ برس تک) حکومت کرنے والا خاندان ثابت ہوا بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی اِس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ لیکن اتنے اہم خاندان کے بانی کے بارے میں بھی مستند تاریخی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں، یہاں تک کہ عثمان کے باپ کا نام بھی کسی ہمعصر دستاویز میں درج نہیں ہے۔ اِس لیے بعد میں اُس کے جانشینوں کو نہ صرف اُس کے حالاتِ زندگی کے بارے میں افسانے تراشنے پڑے بلکہ ارطغل غازی نام کا ایک فرضی والد بھی فراہم کرنا پڑا جس کے وجود کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔[1]

اصل میں دنیا ۱۳۸۹ء میں عثمانیوں کی طرف زیادہ توجہ دینے پر مجبور ہوئی جب جنگِ کوسوو (Battle of Kosovo) میں اُنہوں نے سربیا کی مسیحی افواج کو شکست دے کر بلقان کے خطے میں اپنے قدم جما دیئے۔ یہ اُس کشمکش کا آغاز تھا جو پہلی جنگِ عظیم تک رہی اور موجودہ زمانے میں بوسنیا اور سربیا کی باہمی مخاصمت میں جھلکتی ہے۔ ۱۳۹۴ء میں عثمانیوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ بھی کر لیا جو مشرقی مسیحیت کے قلب کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اُس کے بعد اُن کے بڑھتے ہوئے قدم ایک ایسے طوفان کی وجہ سے پلٹنے پر مجبور ہو گئے جو کسی رکاوٹ کی پروا کیے بغیر ہر ریاست کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا:

جوش کردار سے تیمور کا سَیلِ ہمہ گیر

[1] پاکستان میں گزشتہ چند برسوں میں ارطغل غازی اور سلطان عثمان اُردو میں ڈب کیے ہوئے ترکی ڈراموں کی وجہ سے کافی مشہور ہوئے ہیں لیکن وہ ڈرامے محض تخیلاتی ہیں۔

سَیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز![1]

امیر تیمور (عرصہ ٔحکمرانی ۱۳۷۰ء سے ۱۴۰۹ء) کا تعلق ایک منگول قبیلے سے تھا جو موجودہ ازبکستان میں آباد ہو کر ترک ثقافت اور سنّی اسلامی مذہب اختیار کر چکا تھا۔ اُس نے سمرقند کو دارالحکومت بنایا اور چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی کی اولاد میں سے ایک شہزادی کے ساتھ شادی کرنے کے بعد چنگیز کے مقبوضہ جات کو دوبارہ فتح کرنے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

جنوبی رُوس، ایران، افغانستان، شام، عراق اور ترکی کے بڑے بڑے شہر آگ اور خون کے سیلاب میں ڈوبتے چلے گئے۔ ۱۳۹۸ء میں اُس نے دہلی کو نیست و نابود کیا۔ ۱۴۰۲ء میں تیمور نے اُبھرتے ہوئے عثمانی خاندان کو انگورہ (موجودہ شہر انقرہ) کے معرکے میں شکست دے کر عثمانی سلطان کو گرفتار کر لیا جو اُس کی قید ہی میں مر گیا۔ چین میں مِنگ خاندان (۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء) چنگیز خاں کی اولاد کو برطرف کر کے اقتدار میں آ چکا تھا (جس نے ۱۴۰۶ء سے ۱۴۲۰ء تک موجودہ بیجنگ میں اُن تعمیرات کا آغاز کیا جنہیں اب ''شہرِ ممنوعہ'' یعنی Forbidden City کے نام سے عالمی شہرت حاصل ہے)۔ تیمور نے چین پر حملے کا ارادہ کیا لیکن اُس سے پہلے ہی ۱۴۰۹ء میں فوت ہو گیا۔

جس طرح چنگیز خاں مفتوحہ علاقوں میں خدا کے قہر کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے لیکن منگولیا کے لیے آج بھی ایک قومی ہیرو ہے، اُسی طرح امیر تیمور بھی وسطی ایشیا کے ممالک اور بالخصوص ازبکستان کا قومی ہیرو ہے۔ وہاں اُسے ایک شاندار تہذیب کا بانی بھی سمجھا جاتا ہے، جس کا سب سے نمایاں پہلو اُس کی عالیشان تعمیرات ہیں۔ البتہ جن سرزمینوں پر اُس کے حملے ہوئے، وہاں اُسے زیادہ تر خونریزی کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔

اُس عہد کے سب سے بڑے مؤرخ ابن خلدون (وفات ۱۴۰۶ء) نے تیمور سے

---

[1] اقبال، ''نپولین کے مزار پر'، بالِ جبریل، ص ۲۰۱

ملاقات کا حال تحریر کیا ہے، جو دمشق میں ہوئی جہاں کے شہریوں نے امن کی درخواست کرتے ہوئے اپنا شہر تیمور کے سپرد کر دیا تھا۔ ابن خلدون کے پیش کیے ہوئے تحائف میں سے قرآن شریف کو تیمور نے احتراماً کھڑے ہو کر سر پر رکھا، جائے نماز کو چُوما اور مٹھائی کو اپنے درباریوں میں تقسیم کر دیا۔ اُس کے بعد تین دن تک اُس کے سپاہی دمشق کو لوٹتے رہے کہ صدیوں سے رائج بین الاقوامی قانون کے تحت اِسے ایک فاتح فوج کا حق سمجھا جاتا تھا۔ گھروں کو آگ لگا دی گئی جس میں بے مثال جامع مسجد بھی جل کر خاک ہو گئی۔ تین بعد تیمور نے امن بحال کر دیا۔ یہ اُس شہر کا واقعہ تھا جسے "امان" عطا کی گئی تھی ورنہ مزاحمت کرنے والے شہروں میں سروں کے مینار تعمیر ہوئے۔ صرف اصفہان کے مقتولین کی تعداد ستّر ہزار بتائی جاتی ہے۔

اِس طرح دنیائے اسلام چنگیز خاں کے اثرات سے پوری طرح نکلنے نہ پائی تھی جب تیمور کے ہاتھوں دوبارہ تہ و بالا ہو گئی۔ نہ جانے تقدیر بہک گئی تھی یا مروجہ نظام حکومت دیوانگی کے نمونے بن چکے تھے اور قدرت کے اشارے سمجھنے سے قاصر تھے:

کرتی ہے ملوکیّت آثارِ جُنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز[1]

*

چین کے مسلمان جہازراں ژنگ ہی (۱۴۳۳ء) نے ۱۴۰۵ء سے ۱۴۳۳ء کے عرصے میں مِنگ خاندان کے بحری بیڑے کی قیادت کرتے ہوئے سات سفر کیے اور موجودہ انڈونیشیا، ملائشیا، بھارت، سری لنکا، یمن، سعودی عرب، صومالیہ اور کینیا کے ساحلوں تک

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۴۳

جا پہنچا۔ ژنگ ہی اگرچہ مخنث تھا لیکن اُس کی دلیری اور اعلیٰ اخلاق نے اُسے اِن میں سے اکثر علاقوں کی مقامی آبادی کے لیے ایک انتہائی قابلِ شخصیت بنا دیا۔ ایک پرجوش مسلمان کی حیثیت میں وہ سری لنکا، کالی کٹ (بھارت) اور دُوسرے ساحلی شہروں میں مساجد کی تعمیر اور مرمت کرواتا چلا گیا اور اپنے آخری سفر میں مکہ معظمہ میں حاضری دے کر اِسلامی اخوّت کو ایک نئی انتہا تک پہنچا دیا:

چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا[1]

ژنگ ہی کے سفر فتوحات کے لیے نہ تھے بلکہ اُن کا مقصد دُنیا کے دُور دراز کے حکمرانوں کو شہنشاہِ چین کی طرف سے بیش قیمت تحائف پیش کرنا تھا۔ یہ حربہ جسے مؤرخ تحفوں کی سفارتکاری (tribute diplomacy) کہتے ہیں، کنفیوشس کی تعلیمات سے اخذ کی ہوئی صدیوں پرانی روایت تھی جس میں دُوسرے بادشاہوں کو فوجی طاقت سے مرعوب کرنے کے بجائے اپنے تحائف کی برتری ثابت کر کے احسانمند بنایا جاتا تھا۔ اب چین کے مسلمان نمائندوں نے اِسے ایک نئی وسعت دے کر بحیرۂ ہند پر چین کی بالادستی قائم کر کے افریقہ کے ساحلوں تک چین کی دھاک بٹھا دی۔ بدقسمتی سے ژِنگ ہی کی آنکھ بند ہوتے ہی کنفیوشس کی تعلیمات کے قدامت پرست مبلغوں نے اِسے فضول خرچی قرار دے کر نہ صرف یہ سلسلہ رکوا دیا بلکہ ژنگ ہی کے سفر کے ریکارڈ ضائع کروا کے آیندہ کے لیے بھی چین کی بحری ترقی کا راستہ مسدود کر دیا:

آئینِ نَو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اَڑنا

---

[1] اقبال، 'ترانۂ ملّی' بانگِ درا، ص ۱۷۲

منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں[1]

چین اپنے خول میں سمٹ گیا اور وہ سمندری راستہ کھلا چھوڑ دیا جس کے ذریعے اگلی صدیوں میں یورپ نے نہ صرف مشرق کے دوسرے علاقوں پر قبضہ کیا بلکہ چین کو بھی اندرونی اور بیرونی طور پر کھلا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن اُس سے پہلے خود یورپ کو ایک دو سو سال تک بڑے بڑے طوفانوں سے گزرنا تھا۔

*

یورپ میں طاعون کی ایک خوفناک لہر نے، جسے "سیاہ موت" کہا گیا ہے، ۱۳۴۷ء میں تیس فیصد سے زیادہ آبادی کا صفایا کر دیا۔ باقی کام یورپ والے خود کر رہے تھے جن کے بیشمار چھوٹے چھوٹے بادشاہوں، نوابوں اور جاگیرداروں کی باہمی جنگوں نے اُس براعظم پر ایک مستقل ہیجان کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ لیکن اُسی ہیجان سے وہ شخصیات بھی برآمد ہوئیں جن کی افسانوی شہرت آج تک قومی ثقافتوں اور عالمی نظریات کو سامان فراہم کر رہی ہے۔

انگلستان کے خلاف اسکاٹ لینڈ کی جنگِ آزادی میں ولیم والیس (William Wallace) کا کردار اُبھرا جسے ۱۳۰۵ء میں سزائے موت ملی اور پھر ۱۳۱۴ء میں اسکاٹ بادشاہ روبرٹ بروس نے انگریزی افواج کو شکست دے کر اسکاٹ لینڈ کو خودمختاری دلوا دی (جو ۱۷۰۷ء تک قائم رہی)۔

انگلستان اور فرانس کی صد سالہ جنگ (۱۳۳۷ء سے ۱۴۵۳ء) میں انگریز بادشاہ ہنری پنجم نے ۱۴۱۵ء میں فرانس کے خلاف ایک یادگار فتح حاصل کی لیکن اُس طویل کشمکش کی

[1] اقبال، 'بزمِ انجم'، بانگِ درا، ص ۱۹۱

سب سے مشہور شخصیت سولہ سترہ برس کی غریب دیہاتی لڑکی جون آف آرک ثابت ہوئی، جس نے فرانسیسی نوابوں کو غیرت دلا کر انگریزوں کے مقابل کھڑا کر دیا۔ ۱۴۳۱ء میں اُسے رومن کیتھولک چرچ کے حکم پر زندہ جلایا اور ۱۹۲۰ء میں اُسی چرچ نے اُسے معصوم اور شہید قرار دیا۔

رومن کیتھولک چرچ کی اپنی کیفیت اُس زمانے میں یہ تھی کہ ۱۳۷۸ء میں ایک کے بجائے دو پوپ منتخب ہو گئے۔ ۱۴۰۹ء میں اُن کے درمیان تنازعے کو ختم کرنے کی کوشش کے نتیجے میں دو کے بجائے تین پوپ ہو گئے اور ۱۴۲۹ء میں بڑی مشکل سے چرچ کی وحدت دوبارہ بحال کی گئی۔

یورپ کے مشرقی حصے اور مشرقی آرتھوڈوکس مسیحیت اِس دوران میں ترکوں اور منگولوں کے حملوں کی وجہ سے بکھری رہی لیکن ماسکو کے شہزادے دیمتری دونسکوی نے ۱۳۸۰ء میں قپچاق کے منگولوں کے خلاف فیصلہ کن فتح حاصل کر کے رُوس اور مشرقی یورپ کی تہذیبی یادداشت میں ایک مستقل مقام حاصل کر لیا۔

اسلام کی طرح مسیحیت میں بھی سُود کی ممانعت تھی۔ اِس لیے یورپ میں اگرچہ یہودیوں پر سخت پابندیاں عائد تھیں اور اُن کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جاتا تھا لیکن مالی لین دین کا شعبہ زیادہ تر اُن یہودیوں کے ہاتھوں میں تھا جو سُود پر قرض دینے کا کام کرتے تھے۔ ۱۳۹۷ء میں اٹلی کی شہری ریاست فلورنس کے میڈیچی خاندان نے روپے کی بلاسود تجارت کرنے کے لیے میڈیچی بینک کی بنیاد رکھی، جسے جدید بینکاری کی ابتدا مانا جاتا ہے کیونکہ اِسی نے وہ اصول متعارف کروائے جن پر آج بھی دنیا کی بینکنگ قائم ہے، اگرچہ بعد میں اِس بینک نے بھی سُودی کاروبار ہی اختیار کر لیا۔

میڈیچی خاندان آگے چل کر بہت بااثر ہو گیا اور ۱۴۳۴ء سے ۱۴۹۴ء تک فلورنس کی

سیاست پر چھایا رہا۔ اُس کے بعد بھی ۱۷۰۰ء کے مختلف اوقات میں طاقت حاصل کرتا رہا۔ یہ خاندان علوم وفنون کی سرپرستی کے لیے خاص طور پر مشہور ہے۔

*

اِن دو صدیوں (یعنی ۱۲۵۸ء سے ۱۴۵۳ء تک) میں دنیا اور خاص طور پر دنیائے اسلام کے سیاسی حالات ایسے نہ تھے کہ سائنسی ترقی فروغ پاتی۔ اگرچہ اُس زمانے میں بھی دمشق کے ماہرِ فلکیات ابن شاطر (وفات ۱۳۷۵ء) نے آسمان پر سیاروں کے نقشے میں بڑی اہم اصلاحات کیں لیکن اُس وقت اُن پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔

پچھلی پانچ صدیوں تک جس طرح تقریباً تمام نئی سائنسی تحقیقات تہذیب کی طرف سے سامنے آتی رہی تھیں، وہ سلسلہ اب تھمنے لگا۔ ابن خلدون، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، اِس سلسلے کی آخری کڑی مانے جاتے ہیں، جنہوں نے تاریخ کے سائنسی مطالعے کے لیے بنیاد فراہم کی اور بعض ماہرین اُن کی کتاب مقدمہ (۱۳۷۷ء) کو سوشل سائنسز (عمرانی علوم) کی پہلی جدید کتاب قرار دیتے ہیں۔

بہر حال اُس زمانے کی سب سے بڑی ایجاد مسلم دنیا کے بجائے یورپ میں ہوئی جہاں ۱۴۵۰ء کے قریب جرمنی کے ایک تاجر جوہانس گوٹنبرگ (Johannes Gutenberg) نے، جس کی وفات ۱۴۶۸ء میں ہوئی، طباعت کے اُس طریقے کو فروغ دیا جسے جدید پرنٹنگ پریس کا آغاز قرار دیا جاتا ہے۔

لیکن عام طور پر اُس زمانے میں صرف پہلے سے موجود سائنسی علوم کو محفوظ اور منتقل کیا جا رہا تھا۔ فنِ تعمیر کے جو شاہکار دنیا بھر میں تعمیر کیے جا رہے تھے، اُن سے ظاہر تھا کہ انجینئرنگ کی تعلیم بڑی کامیابی کے ساتھ دی جا رہی ہے۔ طب اور دوسرے علوم بھی

منتقل ہوتے رہے۔ یورپ میں جو نئی درس گاہیں وجود میں آئیں اُن میں ۱۲۸۴ء میں کیمبرج میں اور ۱۳۸۹ء میں ہائیڈلبرگ میں قائم ہونے والی درسگاہیں خاص شہرت رکھتی ہیں (علامہ اقبال نے ۱۹۰۷ء میں کیمبرج کی یونیورسٹی سے سند حاصل کی اور ہائیڈلبرگ میں بھی قیام کیا):

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذّت، کہاں حجابِ دلیل![1]

*

۱۴۴۳ء میں پوپ نے ایک نئی صلیبی جنگ کا اعلان کیا۔ اِس کا مقصد بلقان کے خطے سے عثمانیوں کو بےدخل کرنا تھا، جن کے بارے میں سمجھا جا رہا تھا کہ وہ کمزور اور منتشر ہیں۔ یہ آخری صلیبی جنگ ہی ثابت ہوئی کیونکہ عثمانی افواج نے سلطان مراد نے ۱۴۴۴ء میں موجودہ بلغاریہ میں مسیحی طاقتوں کو شکست دے دی۔

۱۴۵۳ء میں مراد کے اکیس سالہ جانشین سلطان محمد ثانی (عرصۂ حکومت ۱۴۵۱ء سے ۱۴۸۱ء) نے، جسے تاریخ سلطان محمد فاتح کے نام سے یاد رکھنے والی تھی، تقریباً ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔

مشرقی رومی (بازنطینی) سلطنت اب اپنے شاندار ماضی کی دھندلی سی پرچھائیں سے زیادہ نہ تھی۔ شہنشاہ کے پاس صرف سات ہزار سپاہی تھے لیکن شہر کی فصیل اب بھی ناقابلِ تسخیر سمجھی جاتی تھی۔ لیکن سلطان محمد نے تقریباً ستر بحری بیڑوں کو تین چار کلومیٹر تک خشکی پر گھسیٹ کے فصیل کے نسبتاً کمزور حصے کے سامنے پہنچا دیا۔ ہنگری کے ایک

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۹۲

مسیحی کاریگر نے، جس کی خدمات کا معاوضہ رومی شہنشاہ کی استطاعت سے باہر تھا، سلطان محمد کو ایسی تباہ کن توپ بھی بنا دی جس نے قسطنطنیہ کی فصیل میں شگاف پیدا کر دیا۔

بارُود پچھلے دو چار سو برس سے جنگوں میں استعمال کیا رہا تھا لیکن اِس کی حیثیت ایک مہلک شعبدے سے زیادہ نہ رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب بارُود اور توپخانے نے جنگ کا پانسہ پلٹ کر جنگی حربوں میں وہ مرکزی حیثیت حاصل کی جو کئی صدیوں تک برقرار رہی۔

تین دن کے قتلِ عام اور لوٹ مار کے بعد جب شہر میں امن بحال ہُوا تو آخری رومی شہنشاہ قسطنطین یازدہم (Constantine XI) ہلاک ہو چکا تھا۔ عظیم گرجا، آیا صوفیہ (Hagia Sophia)، ایک مسجد میں تبدیل ہو چکا تھا۔ عثمانی سلطان اب قیصرِ روم تھا اور قسطنطنیہ اُس کا دارالسطنت قرار پانے والا تھا۔

مسیحی دنیا اُسی طرح دم بخود تھی جس طرح تقریباً دو سو برس پہلے سقوطِ بغداد کے موقع پر دُنیائے اسلام ساکت رہ گئی تھی۔

نئی زندگی

مشرقی یورپ میں عثمانیوں کے خلاف غم و غصے نے جس کیفیت کو جنم دیا اُس کی سب سے مشہور علامت وِلاڈ ڈریکولا (Vlad Dracula) ہے، جو ۱۴۴۸ء سے ۱۴۷۷ء کے عرصے میں ہزاروں ترکوں اور مسلمانوں کو سُولی پر چڑھا کر قتل کرنے کی وجہ سے اپنے وطن رومانیہ میں ایک ہیرو کے طور پر اور باقی دنیا میں ڈریکولا کے افسانوی رُوپ میں یاد رکھا جاتا ہے۔

لیکن مسلمانوں کے اِس خوف کا وہ نتیجہ جسے ڈریکولا سے بھی زیادہ بھیانک قرار دیا جا سکتا ہے، فلورنس کے فلسفی میکیاولی (۱۴۶۹ء س ۱۵۲۷ء) کا فلسفہ تھا۔ میکیاولی کے قلم نے

اُس فلسفے کو انسانیت کے ضمیر میں ایک ایسی میخ کی طرح گاڑ دیا جس کی تکلیف انسانیت آج تک محسوس کر رہی ہے۔ یہ فلسفہ اُس کی کتاب شہریار *(Il Principe)* میں سامنے آیا، جسے انگریزی میں پرنس (The Prince) کہا جاتا ہے، اور جو ۱۵۱۳ء میں تحریر ہو کر مصنف کی وفات کے پانچ برس بعد ۱۵۳۲ء میں شائع ہوئی۔

میکیاولی نے اپنی کتاب میں طاقت کے اصول بیان کرتے ہوئے کہا کہ طاقت اور اخلاقیات کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اِس لیے ایک حکمران یا سیاستداں کو حسبِ ضرورت ظلم، ناانصافی اور مکاری سے کام لینا چاہیے۔

جس طرح قدیم زمانے میں فارس کی اُبھرتی ہوئی سلطنت نے افلاطون کو اِس طرح دہشت زدہ کیا تھا کہ اُس نے حقائق کی تہ میں اُترنے کے بجائے خیالی تصوّرات کے ایک مہلک نظام کو جنم دیا تھا اُسی طرح چنگیز، قبلائی، تیمور اور سلطان محمد ثانی جیسے شہنشاہوں کے جلال سے متاثر ہو کر میکیاولی نے وہ گھٹیا طریقے ایجاد کیے جن کے ذریعے پہلے سے موجود طاقت کو ناجائز طریقوں سے حاصل کر کے عارضی فائدے اٹھائے جا سکتے تھے لیکن انجام ہمیشہ تباہی اور بربادی کی صورت ہی میں نکلنا تھا۔

یہ درست ہے کہ چنگیز اور تیمور جیسی شخصیات نے طاقت کے جو سرچشمے دریافت کیے اُنہیں اخلاقیات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ لیکن وہ قدرت کے اصولوں کے مطابق ضرور تھے۔ اگر طاقت کے اصولوں کی دریافت میں چنگیز اور تیمور اُن سائنسدانوں کی طرح تھے جو کسی نئی توانائی کو دریافت کر کے اُس سے مہلک ہتھیار بنا لیں مگر دنیا آیندہ اُسی توانائی کو پرامن مقاصد کے لیے بھی استعمال کر سکتی ہو، تو میکیاولی اُس چور کی طرح تھا جو اُس توانائی کو چوری کر کے بلیک مارکیٹ میں بیچ دے لیکن اصل سائنس کو سمجھنے سے اُسے کوئی سروکار نہ ہو۔ اِس لیے علامہ اقبال نے جس طرح دنیائے قدیم کے تمام فلسفوں میں سے افلاطون

کے فلسفے کو سب سے زیادہ تباہ کن بتایا ہے، اُسی طرح جدید دنیا کے تمام فلسفیوں میں سے میکیاولی کو اُنہوں نے شیطان کی طرف سے بھیجا ہُوا قرار دے کر کہا ہے، "ریاستِ فلورنس کا وہ باطل پرست شہری جس کا سُرمہ لوگوں کی آنکھیں اندھی کر گیا! اُس نے بادشاہوں کے لیے ایک نسخہ لکھا جس نے ہماری مٹی میں جنگ کا بیج بو دیا۔ اُس کی فطرت اندھیروں کی طرف چلی گئی۔ اُس کے قلم کی تلوار نے سچائی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا":

آں فلارنساوئ باطل پرست　　سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخۂ بہرِ شہنشاہاں نوشت　　در گلِ ما دانۂ پیکار کشت
فطرتِ او سوئے ظلمت بُردہ رخت　　حق ز تیغِ خامۂ او لخت لخت[1]

*

چنگیز اور تیمور کے اثرات سے لرزتی ہوئی اِس دنیا میں قسطنطنیہ کی فتح بہر حال وہ دھماکہ ثابت ہوئی جس کے بعد گرد بیٹھنے لگی۔

مشرقی رومی سلطنت سے جان بچا کر یورپ آنے والے مسیحی اپنے ساتھ یونانی زبان کے کلاسیک بھی لائے جنہوں نے ایک ایسی تحریک میں جان ڈال دی جو کچھ عرصے قبل اٹلی کی شہری ریاست فلورنس میں میڈیچی خاندان کی سرپرستی کی وجہ سے شروع ہوئی تھی لیکن اب یورپ کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل گئی۔ اِس تحریک کو نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کا نام دیا گیا ہے جس کا مطلب "نئی زندگی" ہے۔ قدیم یونان اور روم کا ورثہ زندہ ہُوا:

ملّتِ رومی نژاد کُہنہ پرستی سے پیر

---

[1] اقبال، اسرار و رموز، ص ۱۳۴

لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں[1]

جس طرح قدیم یونان میں افلاطون کے فلسفے کے بالکل برعکس زینوفون اور ارسطو جیسے صحتمند ذہنوں نے اپنی قوم کو اپنے ضمیر ڈوب کر زندگی کے راز دریافت کرنے کی ترغیب دی تھی، اُسی طرح نشاۃ الثانیہ کی تحریک نے میکیاولی کی شیطانی فکر کے بالکل برعکس یورپ کو اپنے ضمیر میں ڈوب کر نئے حقائق بے نقاب کرنے کی طرف مائل کیا۔ علوم وفنون میں انسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ اطالوی مصوّروں اور مجسمہ سازوں کے شاہکار اِس تحریک کی اولین بہار سمجھے جاتے ہیں جن میں سے لیونارڈو ڈاوِنچی (Leonardo da Vinci؛ ۱۴۵۲ء سے ۱۵۱۹ء) کی مونالیزا اور مائیکلنجلو (Michelangelo؛ ۱۴۷۵ء سے ۱۵۶۴ء) کا بنایا ہوا حضرت داوٗدؑ کا مجسمہ اور روم کے پوپ کی ذاتی عبادت گاہ سسٹین چیپل (Sistine Chapel) کی چھت پر بنائی ہوئی تصویریں خاص شہرت رکھتی ہیں۔

۱۵۱۷ء میں ایک جرمن راہب مارٹن لُوتھر نے رومن پوپ کی روحانی بالادستی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مسیحیت کی "اصلاح" (Reformation) کی تحریک کا آغاز کیا جس کے پیروکار "پروٹسٹنٹ" (Protestant) کہلائے۔

یہ اختلاف نہ صرف عوام کے درمیان خونریزی میں تبدیل ہُوا جس میں ہزاروں افراد نے جان سے ہاتھ دھوئے بلکہ بادشاہوں کے درمیان جنگوں کا باعث بھی بننے لگا:

دیکھ چُکا المنی، شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کُہن کے نشاں
حرفِ غَلط بن گئی عِصمتِ پیرِ کُنِشت

---

[1] اقبال، 'مسجدِ قرطبہ'، بالِ جبریل، ص ۱۳۵

اور ہُوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں[1]

اِس عرصے میں مسیحیت کے نسبتاً پُرامن واقعات میں ۱۵۴۹ء میں مسیحی مشنریوں کی جاپان آمد اور ۱۵۸۲ء میں پوپ گریگوری سیزدہم (Gregory XIII) کی طرف سے اُس کیلنڈر کا نفاذ شامل تھا جسے اب گریگورین کیلنڈر (Gregorian Calendar) کہتے ہیں اور جو دنیا بھر میں عیسوی تقویم کے طور پر نافذ ہے۔

*

وہ صرف یورپ ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں فنونِ لطیفہ کے نئے اسلوب دریافت کرنے اور منجمد نظاموں کے خلاف روحانی بغاوتوں کے پرچم بلند کرنے کا زمانہ تھا۔

برصغیر میں بنارس میں پیدا ہونے والے ہندو سَنت اور شاعر بھگت کبیر اپنے معاشرے کی فرسودہ روایات کو تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے اور غالباً اُسی کے ردِ عمل کے طور پر کچھ عرصے بعد تلسی داس (زمانہ ۱۵۶۰ء کے آس پاس) اپنی شاعری میں ہندو روایات کو ایک نئے انداز میں پیش کرنے والے تھے۔

دُوسری طرف موجودہ ننکانہ صاحب (پاکستان) میں پیدا ہونے والے گُرو نانک (۱۴۶۹ء سے ۱۵۳۹ء) ہندومت کی بدعات سے انحراف کرتے ہوئے وہ تعلیمات پیش کر رہے تھے جو اَب سکھ مذہب کی اساس ہیں:

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اِک مردِ کامل نے جگایا خواب سے[2]

---

[1] اقبال، 'مسجدِ قرطبہ'، بالِ جبریل، ص ۱۳۴

[2] اقبال، 'نانک'، بانگِ درا، ص ۲۷۰

چین کے تانگ ین (Tang Yin) اور جاپان کے سیشو ٹویو (Sesshu Toyo) کا زمانہ بھی یہی ہے جنہوں نے مصوّری کے نئے انداز بھی متعارف کروائے اور اپنے معاشروں میں روحانی بغاوتوں کے علمبردار بھی سمجھے جاتے ہیں۔

اُسی زمانے میں ایران کے مشہور مصوّر کمال الدین بہزاد (وفات ۱۵۳۵ء) نے اُس اسلوب کو تکمیل تک پہنچایا جسے اب "نگارگری" (miniature painting) کہا جاتا ہے۔

فارسی ادب میں اُس زمانے کی مشہور ترین شخصیت مولانا عبدالرحمٰن جامی (۱۴۱۴ء سے ۱۴۹۲ء) ہیں جو ایک عظیم شاعر ہونے کے علاوہ مذہبی عالم بھی تھے۔ مذہبی اور علمی قسم کی ریاکاری کے خلاف احتجاج اُن کے خاص موضوعات میں بھی شامل ہے۔

*

کہیں اِن تہذیبی انقلابات کے اثر سے اور کہیں دُوسری وجوہات کی بنأ پر اَب وہ مضبوط حکومتیں اُبھرنے لگیں جہاں طاقت کے تمام تانے بانے ایک مطلق العنان بادشاہ کے گرد کچھ اِس طرح گھومتے تھے کہ اُنہیں کسی نہ کسی لحاظ سے اُس نظام کے ساتھ تشبیہ دی جاسکتی تھی جسے تقریباً دو سو سال پہلے قبلائی خاں نے چین میں متعارف کروایا تھا۔

انگلستان میں ۱۴۵۵ء سے ۱۴۸۷ء تک جانشینی کے مسئلے پر خانہ جنگی کے بعد ٹیوڈر (Tudor) خاندان (۱۴۸۵ء سے ۱۶۰۳ء) اقتدار میں آیا۔ اس خاندان کے ہنری ہشتم (عرصۂ حکومت ۱۵۰۹ء سے ۱۵۴۷ء) نے ۱۵۳۴ء میں انگلستان کو ایک پروٹسنٹنٹ ریاست میں تبدیل کر دیا جس میں قومی چرچ کا سربراہ خود بادشاہ تھا۔ یہ نظام اُس کی بیٹی الزبتھ اول کے دَورِ حکومت (۱۵۵۸ء سے ۱۶۰۳ء) میں اپنے عروج کو پہنچا۔

اسپین میں فرڈینینڈ اور ازابیلا نے، جو دو اہم مسیحی ریاستوں کے فرمانروا تھے، ایک

مشترکہ حکومت (۱۴۷۴ء سے ۱۵۰۴ء) قائم کی جس نے ۱۴۷۸ء میں "انکویزیشن" (Inquisition) کے نام سے ایک مذہبی ادارہ قائم کیا جس کا مقصد یہودیوں اور مسلمانوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کرنا تھا۔ ۱۴۹۲ء میں اُنہوں نے اندلس کی آخری مسلمان ریاست غرناطہ پر قبضہ کر لیا جس کے بعد ہسپانیہ میں مسلمانوں کا وجود ہی ختم ہو گیا:

ہسپانیہ تُو خُونِ مسلماں کا امیں ہے
مانندِ حرم پاک ہے تُو میری نظر میں
پوشیدہ تری خاک میں سجدوں کے نشاں ہیں
خاموش اذانیں ہیں تری بادِ سحَر میں[1]

قسطنطنیہ پر ترکوں کے قبضے کی وجہ سے مشرق کی طرف جانے والے تقریباً تمام تجارتی راستے مسلمانوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ متبادل راستے تلاش کرنے کی کوشش میں ایک اطالوی مہم جو کرسٹوفر کولمبس نے ۱۴۹۲ء ہی میں اسپین کے بادشاہوں کی سرپرستی میں مغرب کی طرف سمندر کا سفر کیا جس کے نتیجے میں امریکہ کی دریافت کا دروازہ کھلا۔

اسپین کی حریف ریاست پرتگال بھی نئی سمندری راہوں کی تلاش میں سرگرم تھی۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما نے ہندوستان کے لیے بحری راستہ دریافت کیا، اور ۱۵۱۰ء میں پرتگالیوں نے گوا پر قبضہ کر کے برصغیر میں نوآبادیاتی دور کا آغاز کر دیا۔ اُن کی بحری طاقت کی وجہ سے حاجیوں کے قافلے بھی خطرے میں پڑ گئے جنہیں وہ اپنے مذہبی تعصب کی وجہ سے خاص طور پر لُوٹ کر قتل کرتے تھے۔

۱۵۰۰ء میں پرتگالی مہم جو پیڈرو آلوارِس کبرال (Pedro Álvares Cabral) نے برازیل کی سرزمین پر قدم رکھا، جس کے ساتھ ہی جنوبی امریکہ میں یورپی اثرات کا آغاز

[1] اقبال، 'ہسپانیہ'، بالِ جبریل، ص ۱۴۰

ہوا۔ دُوسری طرف ۱۵۲۲ء میں ایک اسپینی بحری جہاز نے زمین کے گرد پہلا بحری سفر مکمل کیا۔

اسپینی حملہ آوروں کے ہاتھوں جنوبی اور وسطی امریکہ کی عظیم سلطنتوں کی تباہی کی داستان پیچیدہ اور دردناک ہے۔ مقامی اقوام بھی بعض وحشیانہ رسوم پر عمل کرتی تھیں جن میں سے دیوی دیوتاؤں کے نام پر اِنسانی قربانی کے شواہد آج بھی دل دہلا دیتے ہیں۔ دُوسری طرف غیر ملکی حملہ آوروں نے اُنہیں جس بے دردی سے لُوٹ کر تباہ و برباد کیا، وہ کسی مبالغے کے بغیر چنگیز اور ہلاکو کی بربریت سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض پہلوؤں میں اُن سے بھی کچھ زیادہ تھا۔

مثال کے طور پر موجودہ میکسیکو کی ازٹیک (Aztec) سلطنت کے شہنشاہ مونٹے زوما نے اسپینیوں کو خوش آمدید کہہ کر مہمان بنایا لیکن اُنہوں نے ۲۰ مئی ۱۵۲۰ء کی رات کو مندر میں مذہبی رسومات ادا کرتے ہوئے افراد کو قتل کر کے اُن کے سونے چاندی کے زیورات لُوٹ لیے۔ چیچک کی وبا جو غیر ملکیوں کی وجہ سے پھیل رہی تھی، نصف کے قریب مقامی آبادی کا صفایا کر چکی تھی لیکن جب قتلِ عام کے جواب میں ازٹیک قوم نے بغاوت کی تو بڑی بیدردی کے ساتھ اُسے موت کے گھاٹ اُتار کر اُس کی پوری تہذیب کو فنا کر دیا گیا۔ ۱۵۳۳ء میں جنوبی امریکہ کے موجودہ ملک پیرو میں واقع عظیم اِنکا تہذیب ایک اور اسپینی فاتح فرانسسکو پزارو (Francisco Pizzaro) کے ہاتھوں اِسی قسم کے فریب، لالچ اور بے رحمی کا شِکار ہو کر ختم ہو گئی۔ اسپینیوں کی اپنی لکھی ہوئی تاریخوں میں ہزاروں مقامی عورتوں کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے اسپینی حملہ آوروں کی ہَوس سے بچنے کے لیے غاروں میں کُود کر جان دے دی یا کسی اور طریقے سے اجتماعی خودکشی کر لی:

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے

قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے[1]

دنیا کے مقبول ترین ادب میں اِس تہذیبی صدمے کی سب سے واضح بازگشت ۱۹۷۴ء میں لکھے جانے والے ابن صفی کے ناولوں کے سلسلے ایڈلاوا میں سنائی دیتی ہے جہاں اِن قدیم نسلوں کا ایک موجودہ جانشین اپنے نسلی دشمنوں کے لیے مجسم انتقام بن جاتا ہے: ''فرانسسکو پزارو برابر نئے جنم لیتا رہا ہے اور مَیں بھی اُس سے پیچھے نہیں رہا۔ کیا تمھیں وہ رات یاد نہیں جب تمہارے سپاہیوں نے میرے گھرانے کی تیس عورتوں کو زبردستی تباہی کے غار میں دھکیل دیا تھا؟''

۱۵۸۰ء میں اسپین کا بادشاہ فلپ ثانی (Philip II) پرتگال کے تاج و تخت کا مالک بھی بن گیا۔

*

اسلامی سلطنتوں میں سے عثمانیوں کی حکومت قسطنطنیہ کی فتح کے بعد یورپ کے بعض ممالک کے علاوہ (جن میں بلغاریہ بھی شامل تھا)، شام، فلسطین، مصر، مغربی افریقہ اور حجاز پر بھی پھیل گئی۔ اِس طرح مکہ اور مدینہ کی نگرانی بھی عثمانیوں کے ہاتھ آ گئی۔

بغداد کی تباہی کے بعد عباسی خاندان کا ایک شہزادہ بھاگ کر مصر چلا گیا تھا جہاں کے مملوک خاندان نے اپنی حکومت کو جواز دینے کے لیے اُسے عباسی خلیفہ تسلیم کر کے اُس سے اپنے لیے سند حاصل کر لی تھی۔ تب سے یہ نام نہاد خلافت اُس شخص کی اولادوں میں منتقل ہو رہی تھی۔ ۱۵۱۷ء میں عثمانی بادشاہ سلطان سلیم اول (عرصۂ حکومت ۱۵۱۲ء سے ۱۵۲۰ء) نے مصر فتح کرنے کے بعد اُس خاندان سے خلافت اپنی طرف منتقل کروالی۔ اِس

[1] اقبال، 'طلوعِ اسلام'، بانگِ درا، ص ۳۱۳

طرح عثمانی سلطنت، ”خلافتِ عثمانیہ“ بن گئی جو ۱۹۲۳ء تک قائم رہی۔

سلیم کے جانشین سلیمان کو سلیمانِ عالیشان بھی کہا جاتا ہے جس کے عہدِ حکومت (۱۵۲۰ء سے ۱۵۶۶ء) میں عثمانی سلطنت اپنے عروج کو پہنچی۔

باقی اسلامی دنیا میں بھی طاقتور سلطنتیں ابھر رہی تھیں۔ فارس میں صفوی سلطنت (۱۵۰۱ء سے ۱۷۳۶ء) قائم ہوئی، جس کے بادشاہ قوّت و شوکت میں عثمانیوں کے ہم پلہ تھے (لیکن اپنے شیعہ عقائد کے نفاذ اور اُن کی ترویج کی کوششوں کی وجہ سے اُن کے تعلقات عثمانیوں کے ساتھ ہمیشہ خراب رہے)۔

تیمور کے جانشینوں میں ظہیر الدین بابر جیسے عجیب و غریب شہزادے کا ظہور ہُوا، جس نے کم عمری میں بے مروّت رشتہ داروں کی بدولت اپنی ریاست سے ہاتھ دھونے کے بعد کئی شہروں کی حکومتیں حاصل کر کے گنوائیں، جنگلوں میں راتیں کاٹیں اور ۱۵۲۶ء میں دہلی کے لودھی خاندان کو شکست دے کر برصغیر میں مغل سلطنت کی بنیاد رکھنے کے چار برس بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اُس کی خودنوشت بابر نامہ اپنی دیانتداری اور گہرائی کی وجہ سے دنیا کے ادب میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

بابر کے بیٹے ہمایوں نے اپنے باپ کی سلطنت گنوا کر دوبارہ حاصل کی، جس کے دوران میں شیر شاہ سوری نے پانچ برس کے مختصر عرصے (۱۵۴۰ء سے ۱۵۴۵ء) میں حیرت انگیز طور پر وہ انتظامی ڈھانچہ نافذ کر دیا جسے مزید ترقی دے کر ہمایوں کے بیٹے جلال الدین اکبر (۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء) نے مغل سلطنت کو عروج پر پہنچا دیا۔

*

اِس طرح اب دنیا کے اکثر خطوں میں ایسے مطلق العنان حکمراں اُبھر چکے تھے جو ماضی

کے شہنشاہوں کے مقابلے میں تقریباً لا محدود طاقت کے حامل دکھائی دیتے تھے یہاں تک کہ اُن کی طاقت کو اُن کی ذاتی شخصیت کا کرشمہ سمجھ لیا گیا۔ لیکن حقیقت اِس کے برعکس معلوم ہوتی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ حکمراں پچھلے زمانے کے حکمرانوں سے زیادہ طاقتور تھے ہی اِس لیے کہ پچھلے حکمرانوں کے برعکس وہ خود کسی طاقت کا سرچشمہ نہ تھے۔ وہ محض ایسے نظاموں کے مظہر تھے جو ہزاروں ہاتھوں، آنکھوں اور کاغذوں پر مشتمل تھے۔ وہ ایک بہت بڑے جال کے مرکز میں بیٹھے تھے جس میں طاقت ہر سمت بہتی تھی۔ بس شرط یہ تھی کہ وہ ایک اداکار کی طرح وہی کردار نبھاتے رہیں جو اُس نظام نے اُن کے سپرد کیا تھا۔ اُن کا کمال یہ نہیں تھا کہ وہ تنہا حکومت کرتے تھے بلکہ یہ کہ وہ اِتنے بڑے نظام کے ساتھ اِس طرح ہم آہنگ تھے کہ وہی نظام اُن کی ذات سے طاقت کی روشنی پھوٹتی ہوئی محسوس کراتا تھا۔

یہ درست ہے کہ اِس نظام کو چلانے کے لیے جتنی سخت سزاؤں کو روزمرہ کا معمول بنایا گیا اُس کی مثالیں ماضی میں بھی کم کم رہی تھیں اور آج بھی اُن کا تصوّر کر کے روح کانپ جاتی ہے۔ قبلائی خاں کے جس نظامِ پیغام رسانی کی تعریف کی جاتی ہے، عوام اُس کی چوکیوں کے قریب جانے سے بھی ڈرتے تھے کیونکہ اُس نظام میں خلل ڈالنے کی سزا موت تھی جو بعض اوقات مجرم کے پورے خاندان کو ملتی تھی۔ اِس قسم کی سزائیں روزمرہ کے معمولات میں سے تھیں جن کی تفصیلات اُس زمانے کی دستاویزات میں بکھری پڑی ہیں، مثلاً ۱۲۷۳ء میں ایک چھوٹے افسر کا اُس کے گاؤں کے سامنے سر قلم کیا گیا کیونکہ اُس نے ایک تاجر کو ڈاک کا گھوڑا استعمال کرنے کی اجازت دی تھی حالانکہ علاقے کے گورنر کے ساتھ اُس تاجر کے قریبی تعلقات تھے۔ ریاست کی طرف سے سپرد

کی گئی ذمہ داری پوری نہ کرنے پر معذوری کا عذر بھی قبول نہیں کیا جاتا تھا، مثلاً ۱۲۸۷ء میں جنوبی چین میں ایک بیاسی سالہ بوڑھے جولاہے کو کوڑے مارنے کا حکم دیا گیا کیونکہ اُس کا گھرانہ ریشم کی مطلوبہ مقدار شاہی خزانے کو نہیں بھجوا سکا تھا۔ بوڑھا بینائی سے بھی محروم تھا لیکن منصف نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ کسی مصیبت زدہ کی خاطر شاہی وقار مجروح نہیں کیا جا سکتا۔

صرف قبلائی خاں کی بات نہ تھی بلکہ اگلے پانچ سو برس میں سب سے زیادہ روشن خیال سمجھے جانے والے مسلمان اور مسیحی بادشاہوں کے تحت بھی یہی معمولات رائج تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اِس نظام کو طاقت کے قدرتی اصولوں پر قائم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اِس لیے جس طرح قدرت کے قوانین کسی کے دُکھ درد کی رعایت نہیں کرتے، اُسی طرح یہ نظام بھی اِس معاملے میں قدرت ہی کی طرح بے حس تھا۔

لیکن اِسی وجہ سے اِس امکان پر غور کرنا پڑتا ہے کہ اِس نظام کی تمام سخت گیری کے باوجود اِس کے تحت عوام صرف محکوم نہ رہے ہوں بلکہ کسی گہرے اور غیر محسوس اشتراک کا تجربہ بھی کرتے ہوں، جو سلطنت کی عظمت میں اُن کی شرکت کا ایک خاموش اشارہ رہا ہو۔ کیونکہ ہر شخص، چاہے کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اُس جال کا ایک تار تھا۔ کسی نہ کسی سطح پر اُسے اُس طاقت کی رمق ضرور محسوس ہو سکتی تھی جو ہر لمحے اُس کے وجود سے گزر کر مرکز کی طرف جا رہی تھی۔ بالکل اُسی طرح جیسے ایک ساز کے تار میں اُس موسیقی سے ارتعاش پیدا ہوتا ہے جس کا وہ تار صرف ایک معمولی حصہ ہوتا ہے:

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیّت نہ ہو — یہ جگر سوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوّت نہ ہو — رشکِ جامِ جم مرا آئینۂ حیرت نہ ہو[1]

---

[1] اقبال، 'گلِ رنگیں'، بانگِ درا، ص ۷

اِن سوالوں کے جواب اُس وقت ملے جب ۱۵۸۸ء میں انسان کی یہ طاقت سمندر کی لہروں سے ٹکرا گئی۔ اُس برس اسپین کے تقریباً ۱۳۰ بحری جہازوں پر مشتمل بیڑے نے اندازاً تیس ہزار سپاہیوں اور جہازیوں کے ساتھ انگلستان پر حملہ کیا، جسے اسپینی آرمیڈا (Spanish Armada) کہا جاتا ہے۔

اسپین کا رومن کیتھولک بادشاہ فلپ ثانی انگلستان کی پروٹسنٹ ملکہ الزبتھ کو شکست دینا چاہتا تھا۔ اسپین ایک عالمی قوّت تھا جس کے مقابلے میں انگلستان کو بہت کمزور سمجھا جاتا تھا لیکن غیر متوقع طور پر اسپین کو ناکامی ہوئی۔ حملہ آور بیڑے کے بمشکل نصف جہاز سلامتی کے ساتھ وطن واپس پہنچ سکے۔

"خدا نے سانس لی اور وہ منتشر ہو گئے!" ("God blew and they were scattered") بعض لوگوں کے خیال میں یہ جملہ ملکہ الزبتھ نے کہا تھا لیکن کسی نے بھی کہا ہو، بہر حال یہ انگریزوں میں ایک نئی خود اعتمادی کے اظہار کے لیے مشہور ہو گیا۔ ۱۶۰۰ء تک اُنھوں نے دُور دراز کے علاقوں سے تجارت کرنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر لی۔

لیکن اُس سے بہت پہلے، آرمیڈا پر فتح پانے کے اولین ردِ عمل کے طور پر جو رجحان انگریزوں میں پھیلا، وہ تھیٹر کا جنون تھا۔ اور وہی جنون ہمیں طاقت کے جال کے بارے میں ہمارے مشکل ترین سوالات کے جوابات کا سراغ دیتا ہے۔

شیکسپیئر کی دُنیا

۱۵۸۸ء سے انگریزی ڈراموں کا سنہرا دَور شروع ہوتا ہے جب بیشمار ڈرامہ نگار لندن کے اسٹیج پر اُبھرے اور گاؤں گاؤں گھوم کر تماشہ دکھانے والی کمپنیوں نے اُن ڈراموں کو ملک

کے دوسرے حصوں تک پہنچا دیا۔ اُن میں سب سے زیادہ مقبول ولیم شیکسپئیر (۱۵۶۴ء سے ۱۶۱۶ء) تھا، جسے اگلے ڈیڑھ دو سو برس تک انگریز صرف ایک مقبول مصنف سمجھتے رہے لیکن آج اُسے دنیا کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُس کے ڈرامے بائبل کے ساتھ رکھے جاتے ہیں، بالکل اُسی طرح جیسے اسلامی دنیا میں مولانا روم کی مثنوی "فارسی میں قرآن" کہلاتی ہے۔

شیکسپئیر کے ڈرامے عوام اور خواص برابر مقبول تھے۔ معاشرے کے نچلے سے نچلے طبقے کے افراد بھی اُس کے تھیٹر میں کھنچے چلے آتے تھے اور ملکہ الزبتھ اپنے دربار میں اُس کے ڈرامے اسٹیج کروا کے دیکھتی تھی۔ اِس طرح شیکسپئیر اور اُس کے ہمعصر ڈرامہ نگاروں کی کرامت سے بادشاہ اور فقیر ایک ہی خواب دیکھنے لگے۔

اور وہ خواب کیا تھے؟ شیکسپئیر نے سب سے پہلے انگریزی تاریخ کے بارے میں ڈرامے لکھ کر مقبولیت حاصل کی۔ جس طرح فردوسی نے اپنی قوم کی تاریخ عوام کے ہاتھوں میں رکھ دی تھی، وہی کام شیکسپئیر نے اپنی قوم کے لیے کیا۔ اُس کے بعد رومیو اینڈ جولیٹ، ہیملٹ اور دوسرے ڈرامے لکھ کر اُس نے انسانی فطرت کو اِس طرح بے نقاب کیا کہ اُس سے زیادہ ممکن ہی نہ تھا:

حفظِ اَسرار کا فطرت کو ہے سَودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا[1]

*

چونکہ اب ہم اُس دَور میں داخل ہو رہے ہیں جو ہمارے اپنے زمانے سے بمشکل چار سو یا

---

[1] اقبال، 'شیکسپئیر'، بانگِ درا، ص ۲۸۳

ساڑھے چار سو سال پہلے کا زمانہ ہے، اِس لیے یہاں سے ادبیات اور فنونِ لطیفہ میں اِتنے سارے مشہور ترین نام ہمارے سامنے آنے لگتے ہیں کہ اُن سب کا ذکر کرنا بھی اِس مختصر کتاب میں ممکن نہیں ہے۔ صرف مغل ہندوستان ہی میں موسیقار تان سین (وفات ۱۵۸۹ء)، شاعر عرفی شیرازی (وفات ۱۵۹۱ء)، مورخ ابوالفضل (وفات ۱۶۰۲ء) اور مصوّر بشن داس (زمانہ ۱۶۲۰ء کے قریب) جیسے بڑے نام ہی اِتنے زیادہ ہیں کہ ایک علیحدہ باب کا تقاضا کرتے ہیں۔ اُس عہد کی سب سے مشہور یادگار تاج محل کے بارے میں، جسے ۱۶۴۸ء میں آگرہ میں تعمیر کیا گیا، اقبال نے کہا ہے کہ اُس کا اس کا سنگِ مرمر بہتے پانی سے بھی زیادہ رواں ہے، اور وہاں کا ایک لمحہ ابد سے زیادہ دیرپا ہے۔ عاشقوں نے پلکوں کی نوک سے پتھروں کو تراش کر اپنے دل کا راز ظاہر کر دیا ہے:

مرمرش ز آبِ رواں گردندہ تر　　　یک دم آنجا از ابد پایندہ تر
عشقِ مرداں سرِّ خود را گفتہ است　　　سنگ را بانوکِ مژگاں سُفتہ است[1]

جاپان میں چکاماتسو مون زائی مون (Chikamatsu Monzaemon)، جس کا عرصہ حیات ۱۶۵۳ء سے ۱۷۲۵ء ہے، روایتی تھیٹر کو نیا روپ دے رہا تھا۔ فرانس میں وہاں کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار مولئیر (Molière) کا ظہور ہو رہا تھا، جس کا زمانہ ۱۶۲۲ء سے ۱۶۷۳ء ہے۔ نیدرلینڈ کے ریمبراں (Rembrandt van Rijn) سمیت، جس کا عرصۂ حیات ۱۶۰۶ء سے ۱۶۶۹ء ہے، یورپ کے بعض بڑے مصوّروں کا زمانہ بھی یہی ہے۔ اسپین میں میگل دی سروانتس (Miguel de Cervantes) نے، جس کا عرصۂ حیات ۱۵۴۷ء سے ۱۶۱۶ء ہے، اپنی تصنیف ڈان کیخوٹے (Don Quixote) میں کہانی کو وہ صورت دی جسے جدید ناول کی پہلی بڑی مثال سمجھا جاتا ہے (یہ ناول ۱۶۰۵ء اور ۱۶۱۵ء میں

[1] اقبال، 'بندگی نامہ'، زبورِ عجم، ص ۲۶۳

دو حصوں میں شائع ہوا)۔

اِن میں سے ہر ایک کا اپنا مقام ہے لیکن صرف شیکسپئیر (اور بعد کے زمانے میں آنے والے گوئٹے) ہی کے بارے میں اقبال نے یہ کہا ہے کہ وہ "خدا کے تخلیق کرنے کے خیال کو اپنی فکر میں پیش کرتے ہیں۔"[1] یعنی خدا اپنے بنائے ہوئے جن قوانین کے مطابق انسانی معاشروں کو تخلیق کرتا اور چلاتا ہے، شیکسپئیر (اور بعد میں گوئٹے) نے اُسی سوچ کو اپنے ڈراموں کے ذریعے اسٹیج پر پیش کر دیا۔ اِس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر طاقت کے جال میں ہر فرد ایک تار کی حیثیت رکھتا تھا تو شیکسپئیر نے اُس کا ارتعاش عوام کو روحانی طور پر محسوس کروا دیا۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اگلے سو برس میں برطانوی قوم ایک بتدریج ارتقاٗ کے ذریعے ایک مطلق العنان بادشاہ کے بجائے عوام کی اجتماعی رائے کو طاقت کے نظام کے مرکز میں رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔

*

جیسا کہ پہلے ذکر ہُوا، انگلستان ۱۵۴۳ء سے ایک پروٹسنٹنٹ ریاست تھا۔ پانچ برس (۱۵۵۳ء سے ۱۵۵۸ء) کے لیے اقتدار ایک کیتھولک ملکہ، مَیری اول (Mary I)، کے ہاتھوں میں آیا تو اُس نے پروٹسنٹ فرقے سے بدلہ لیا اور اُس فرقے کے ڈھائی سو سے زیادہ لوگوں کو زندہ جلا دیا۔ پروٹسٹنٹ دوبارہ برسرِ اقتدار آئے تو اُنہوں نے کیتھولک افراد کے خلاف قوانین زیادہ سخت کر دیئے۔ اب اُس فرقے کے لوگ یونیورسٹیوں اور سرکاری عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتے تھے، آزادانہ اپنی مذہبی رسومات ادا نہیں کر سکتے تھے

[1] "Both Shakespeare and Goethe rethink the thought of Divine creation."

اور کسی کو اپنے مذہب کی دعوت دینے پر موت کی سزا پاتے تھے۔

۱۶۰۵ء میں بعض کیتھولک افراد نے پارلیمنٹ کو بارُود سے اُڑا کر بادشاہ اور اہم سیاسی شخصیات کو ہلاک کرنے کی سازش کی جو وقت سے پہلے بے نقاب ہو گئی۔ سازش کرنے والوں کو دردناک طریقے سے سزائے موت دی گئی، جن میں سے گائے فاکس (Guy Fawkes) زیادہ مشہور ہے۔ کیتھولک انگریزوں نے خود بھی اِس سازش کی سخت مذمت کی کیونکہ یہ اُن کے مسیحی ضمیر اور انگریزی مزاج دونوں کے خلاف تھی۔ پھر بھی اُن کے خلاف سختیوں میں اضافہ کر دیا گیا۔

لیکن اصل سیاسی بھونچال اُس وقت آیا جب بادشاہ چارلس اول (عرصۂ حکمرانی ۱۶۲۵ء سے ۱۶۴۹ء) اور برطانوی پارلیمنٹ کے درمیان کشمکش شروع ہوئی۔ بادشاہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر نئے ٹیکس نافذ نہیں کر سکتا تھا لیکن پارلیمنٹ کے اجلاس منعقد اور برخواست کرنے کا اختیار بادشاہ کے پاس تھا۔ ۱۶۴۰ء میں پارلیمنٹ نے بادشاہ کی طاقت پر مزید پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی اور چارلس نے اُسے برخواست کرنے کا اعلان کیا لیکن اِس دوران میں پارلیمنٹ ایک نئے قانون کے ذریعے بادشاہ سے یہ حق چھین چکی تھی۔

۱۶۴۲ء سے ۱۶۴۹ء تک بادشاہ کے حامیوں اور پارلیمنٹ کے حامیوں کے درمیان دو دفعہ جنگ (English Civil War) چھڑی۔ آخر میں سیاستداں اور سپہ سالار اولیور کرامویل (Oliver Cromwell) نے بادشاہت کا خاتمہ کر کے جمہوری حکومت قائم کی جسے دولتِ مشترکہ (Commonwealth) کہا جاتا تھا۔ چارلس پر مقدمہ چلایا گیا اور ۱۶۴۹ء میں اُسے سزائے موت دے دی گئی۔

دولتِ مشترکہ کے گیارہ سالہ دورِ حکومت (۱۶۴۹ء سے ۱۶۶۰ء) میں کرامویل نے

فوجی طاقت اور مذہبی قوانین کو بنیاد بنا کر ریاست کو سنوارنے کی کوشش کی کیونکہ پارلیمنٹ اپنی اندرونی کمزوریوں پر قابو نہ پاسکی تھی۔ کرامویل کے حامیوں میں آج سب سے مشہور نام انگریز شاعر جان ملٹن ہے، جس نے ۱۶۴۴ء میں اپنے پمفلٹ آریوپیجیٹیکا (Areopagitica) میں خالص مذہبی اور روحانی بنیادوں پر اظہارِ رائے کی آزادی کی حمایت میں ایسے روحانی دلائل پیش کیے جو جدید روایتِ آزادیٔ اظہار کی بنیاد بنے۔

۱۶۵۸ء میں کرامویل کی وفات کے بعد اُس کی اصلاحات ناکام ہوتی دکھائی دینے لگیں۔ ۱۶۶۰ء میں پارلیمنٹ نے مقتول بادشاہ کے بیٹے کو واپس بلا کر چارلس دوم کے نام سے تخت نشین کر دیا لیکن اب عملاً بادشاہ کے پاس وہ طاقت نہ رہی جو پہلے ہوتی تھی۔

۱۶۸۵ء میں چارلس دوم کی وفات کے بعد اُس کا چھوٹا بھائی جیمز دوم حکمراں بنا، جو کیتھولک تھا اور صرف ساڑھے تین برس میں غیر مقبول ہو گیا۔ ۱۶۸۸ء میں پارلیمنٹ اور فوج نے اُس کا ساتھ چھوڑ کر اُس کی پروٹسٹنٹ بیٹی مَیری اور مَیری کے شوہر ولیم کو، جو ایک ولندیزی (Dutch) شہزادہ تھا، انگلستان بلایا اور جیمز ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔

یہ شاندار انقلاب (Glorious Revolution) کہلاتا ہے کیونکہ اِس میں کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ ۱۶۸۹ء میں پارلیمنٹ نے تاج و تخت مَیری اور ولیم کے حوالے کرتے ہوئے یہ طے کروالیا کہ آیندہ بادشاہ پارلیمنٹ کے وفادار رہا کریں گے۔ اِس معاہدے کو ۱۶۸۹ء کا منشورِ حقوق (Bill of Rights 1689) کہا جاتا ہے۔

اِس عمل کے ذریعے انگلستان نے سیاسی ارتقا کا ایک قدرتی قانون دریافت کیا تھا۔ اِسی لیے، دوسری قوموں کے برعکس، یہاں کسی مرحلے پر کوئی بڑی پچھلی غلطی دوبارہ نہیں دہرائی گئی۔ بعد میں رونما ہونے والے دوسرے سیاسی انقلابات کے برعکس یہاں پہلے سے کوئی سیاسی آئیڈیالوجی بھی موجود نہیں تھی بلکہ انگلستان کے سیاسی فلسفے اِس عمل کے

دوران اِس کی تشریح کے طور پر سامنے آئے۔

ٹامس ہوبز (۱۵۸۸ء سے ۱۶۷۹ء) نے اپنی کتاب لیویاتھان (Leviathan) میں، جو ۱۶۵۱ء میں شائع ہوئی، یہ نظریہ پیش کیا کہ ریاست عوام کی باہمی رضامندی سے وجود میں آتی ہے، جسے ہوبز نے "سماجی معاہدہ" (social contract) کہا۔ لیکن ہوبز کے خیال میں انسان فطرتاً خودغرض اور بے رحم تھا اِس لیے جس سماجی معاہدے کے ذریعے ریاست وجود میں آتی تھی وہ تمام اقتدار ایک فردِ واحد کے سپرد کردیتا تھا جس کی اطاعت سب پر لازم ہوتی تھی۔ اِس نظریے نے بادشاہوں کی اُسی مطلق العنان طاقت کو جواز فراہم کردیا جس سے انگریز پیچھا چھڑانے کی کوشش کررہے تھے۔

اِس لیے جان لاک (۱۶۳۲ء سے ۱۷۰۴ء) نے حکومت کے موضوع پر دو مقالوں (Two Treatises on Government) میں، جو ۱۶۸۹ء میں شائع ہوئے، ہوبز کے نظریے میں یہ ترمیم پیش کی کہ قدرت نے ہر انسان کو بعض حقوق عطا کیے ہیں اور سماجی معاہدے کے تحت دراصل اُنہی حقوق کے تحفظ کے لیے ریاست تشکیل دی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر حکمراں اُن فطری انسانی حقوق کو تحفظ نہ دے سکے تو ایسے حکمراں کو برطرف بھی کیا جاسکتا ہے اور اُس کے اختیارات محدود بھی کیے جاسکتے ہیں۔ یہ نظریہ اُس سیاسی تبدیلی کو جواز پیش کرتا تھا جس کے تحت انگلستان میں بادشاہ کو پارلیمنٹ کا پابند بنایا جارہا تھا۔

لیکن اِس دوران میں دو سیاسی جماعتیں بھی وجود میں آگئی تھیں جنہیں لاک نے مذہبی فرقوں کی طرح تباہ کن قرار دیتے ہوئے لکھا، "ایک سیاسی جماعت ایسے افراد کا گروہ ہوتی ہے جو کسی خاص مفاد کے لیے قوم کے باقی افراد کے خلاف متحد ہوجاتے ہیں۔"[1]

[1] A sect is a company of men united upon the same false opinion; a party is a company of men united upon some interest in opposition to the rest of the community.

چونکہ انگریزوں نے جذباتی انداز میں بغاوتیں کرنے کے بجائے ٹھوس عمل کے ذریعے طاقت کے قدرتی قوانین کو دریافت کر کے دکھایا تھا اِس لیے آج دنیا میں جہاں کہیں بھی عوام کی حکومت ہے، اُسے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اُسی برطانوی پارلیمنٹ کا اثر سمجھا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں:

> انگلستان کی سرزمین کے ہر ذرّے میں اُن لوگوں کا خون چمکتا ہوا نظر آتا ہے جنہوں نے سیاسی حقوق کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں۔ باغیوں کی طرح نہیں بلکہ ان لوگوں کی طرح جن کے دلوں میں اپنے وطن کے قانون اور رسوم کی عزّت ہوتی ہے اور جو اپنے گراں قدر خون کے قطرے قانون کی تائید میں بہاتے ہیں نہ اس کی تردید اور مخالفت میں![1]

*

باقی دنیا اِس قسم کی داخلی تبدیلیوں سے بے نیاز رہی تھی۔

یورپ میں کئی ریاستوں کے درمیان تیس سالہ جنگ کے بعد ۱۶۴۸ء میں ویسٹ فیلیا کے معاہدے (Treaty of Westphalia) میں بعض ایسے اصول تسلیم کیے گئے جنہیں جدید ریاست کی بنیاد سمجھا جاتا ہے، مثلاً بادشاہ ایک دُوسرے کے معاملات میں مداخلت نہ کریں، تمام بادشاہ بعض معاملات میں ایک دوسرے کے برابر سمجھے جائیں، ہر بادشاہ اپنی ریاست کے مذہبی معاملات کا فیصلہ خود کرے اور پوپ جیسی کسی بین الاقوامی شخصیت کو بادشاہوں پر حکم چلانے کی اجازت نہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ سب باتیں ریاست کی اصل روح کو نہیں چھوتیں اور نہ ہی اِن سے طاقت کے اصل راز پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

---

[1] مکتوب بنام نگم اندازاً مارچ ۱۹۰۶ء؛ برنی، اول، ص ۱۲۳، ۱۲۰

چنانچہ یورپ کے بادشاہ اپنے اپنے زمانے کے قبلائی خاں بننے کی کوشش کرتے رہے۔ فرانس میں لوئی چہاردہم (Louis XIV)، جو ۱۶۴۳ء سے ۱۷۱۵ء تک حکمراں رہا اگرچہ اُس کا عملی اقتدار ۱۶۶۱ء میں شروع ہُوا، اپنے آپ کو "سُورج بادشاہ" (Sun King) قرار دے کر کہہ رہا تھا، "میں ہی ریاست ہُوں" (L'État, c'est moi)۔ پیٹر اعظم (Perer the Great) نے ۱۶۸۲ء سے ۱۷۲۵ء تک رُوس کے بادشاہ کی حیثیت میں اپنی قوّت میں وہ بے پناہ اضافہ کیا جس کی وجہ سے رُوس کے بادشاہوں کا لقب "زار" (Tzar) شخصی طاقت کا مترادف بن گیا۔ جاپان میں ۱۶۱۳ء میں فوجی حکومت (shogunate) کا نظام نافذ کیا گیا جو تقریباً دو صدیوں تک رائج رہا۔

اسلامی دنیا میں سلطنتِ عثمانیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا اور ۱۶۸۳ء میں ویانا کے ناکام محاصرے کے بعد مغرب کی طرف اِس کے حملوں کا سلسلہ بھی تھم گیا۔ البتہ فارس کی صفوی سلطنت شاہ عباس اول کے دَور حکومت (۱۵۸۸ء سے ۱۶۲۹ء) میں اپنے عروج پر پہنچی۔

برصغیر میں یہ تمام عرصہ مغل خاندان کے عظیم ترین شہنشاہوں کا زمانہ تھا یعنی جلال الدین اکبر (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے)، نورالدین جہانگیر (۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۷ء)، شہاب الدین شاہجہاں (۱۶۲۸ء سے ۱۶۵۸ء) اور محی الدین عالمگیر (۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء)، جو اپنے پیدائشی نام اورنگزیب سے زیادہ مشہور ہے، اور جس نے مغل سلطنت کو اِتنا وسیع کر دیا کہ برصغیر کے صرف دو کونے ہی اس کی سرحدوں سے باہر رہ گئے۔ یعنی شمال مشرق میں آسام، اروناچل اور ناگالینڈ کے پہاڑی علاقوں اور جنوب میں کیرالہ اور تامل ناڈُو کو چھوڑ کر باقی تمام برصغیر مغل سلطنت میں شامل تھا (کابل اور مشرقی افغانستان ہمیشہ سے اِس میں شامل رہے تھے)۔

اورنگزیب کی کوشش تھی کہ طاقت کا سرچشمہ بادشاہ کی ذات کے بجائے شریعت کے قوانین کو مانا جائے۔ اگرچہ یہ کوشش عملی طور پر کامیاب نہ ہو سکی لیکن برصغیر کے مسلمانوں میں قومیت کا احساس ضرور بیدار کر گئی۔ چنانچہ اقبال نے اورنگزیب کی شخصیت اور کارناموں کو برصغیر میں مسلم قومیت کی نشو و نما کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہوئے کہا ہے:

> میرے نزدیک کردار کا جو نمونہ عالمگیر کی ذات میں جھلکتا ہے، وہ دراصل مسلمان کردار کی اصل مثال ہے، اور ہماری تمام تعلیم کا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ ہم ایسا کردار پیدا کریں۔ اگر ہماری خواہش ہے کہ ہماری قوم کی زندگی مسلسل قائم رہے تو ہمیں ایسا کردار پیدا کرنا ہو گا جو ہر حال میں اپنی اصل کو تھامے رکھے، جو دوسروں کی اچھی باتوں کو اپنانے میں دیر نہ کرے لیکن اپنی روایات اور اداروں کے خلاف کسی بھی چیز کو اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دے۔[1]

اِسی دَور میں مسلم اقتدار کے خلاف مزاحمت کی دو نئی تحریکیں بھی سامنے آنے لگیں۔ سکھ مذہب کے دو گروؤں کو مغل شہنشاہوں نے سزائے موت دی تھی اِس لیے ۱۶۹۹ء میں گُرو گوبند سنگھ نے سِکھوں کو جنگ اور مزاحمت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اُن کا قول تھا:

چڑیوں سے میں باز تڑاؤں   تبئے گوبند سِنگھ نام کہاؤں

دکن اور مہاراشٹر کے ہندو سرداروں کا ایک طبقہ مرہٹہ کہلاتا تھا۔ اُن میں سے سیوا جی بھونسلہ نے، جس کا عرصۂ حکومت اندازاً ۱۶۴۵ء سے ۱۶۸۰ء تھا، دکن کے مسلمان

---

[1] Iqbal, 'The Muslim Community—A Sociological Study'; Sherwani, *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*, p.127

حکمرانوں کے خلاف بغاوت کر دی اور جب مغلوں نے دکن فتح کیا تو مرہٹوں اور مغلوں کے درمیان ٹھن گئی۔

*

اِس دوران میں ابھرنے والے مسلمان مفکرین میں سے فارس کے مُلّا صدرا (وفات ۱۶۴۰ء) کے علاوہ برصغیر کے شیخ احمد سرہندی (وفات ۱۶۲۵ء) خاص طور پر مشہور ہیں، جنہیں مجددالف ثانی بھی کہا جاتا ہے:

وہ ہِند میں سرمایۂ ملّت کا نِگہباں
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار[1]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب فلسفیانہ اور سائنسی فکر میں اصل پیشرفت یورپ میں ہو رہی تھی۔

انگریز مفکر سر فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء سے ۱۶۲۶ء) نے علم کے حصول میں سائنسی طریقے کی اہمیت کو واضح کیا جس کی وجہ سے اقبال نے اپنی نجی نوٹ بک میں لکھا، "حقائق سے زیادہ عام کچھ نہیں لیکن انسان اُن کی طرف سے غافل ہی رہا یہاں تک کہ بیکن نے اُس کی آنکھیں کھولیں۔"[2] بیکن کے ٹھوس سائنسی طریقے کے مقابلے میں فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹس (Rene Descartes؛ ۱۵۹۶ء سے ۱۶۵۰ء) نے خالص عقلی دلائل کی مدد سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی: "میں سوچتا ہوں، اِس لیے میرا وجود ہے" ("cogito, ergo sum")۔ ہالینڈ کے یہودی فلسفی باروخ اسپنوزا (Baruch Spinoza

---

[1] اقبال، "پنجاب کے پیرزادوں سے"، بالِ جبریل، ص ۲۱۱

[2]

۱۶۳۲؛ ۱۶۷۷ء) نے خلافِ عقل مذہبی عقائد پر تنقید کی۔ ہیوگو گروٹس (Hugo Grotius؛ ۱۵۸۳ء سے ۱۶۴۵ء) نے جنگ اور امن کی عقلی بنیاد فراہم کی جسے بین الاقوامی قانون کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ اُس دَور کے سب سے بڑے سیاسی مفکرین ٹامس ہوبز اور جان لاک کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

سائنس میں نئی دریافتوں کا سلسلہ جو تقریباً تین صدیوں سے ماند پڑا ہوا تھا اب پھر تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اِس دفعہ قدرت کے قوانین کو دریافت کرنے پر زور تھا۔ ۱۵۴۳ء میں اٹلی کے ایک عالم اور چرچ کے رُکن نکولس کوپرنیکس (Nicolaus Copernicus) نے تجویز کیا تھا کہ زمین اور سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں (ہزاروں سال سے انسان یہ سمجھتا آیا تھا کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے، اور چرچ بھی یہی تعلیم دیتا رہا تھا)۔ اُس وقت کسی نے اِس نظریے پر توجہ نہ دی تھی لیکن ۱۶۱۰ء کے قریب اٹلی ہی کے ایک سائنسداں گیلیلو نے دُوربین کی مدد سے سیاروں کا مشاہدہ کر کے اِس بات کے ثبوت فراہم کر دیئے۔ چرچ نے سخت مخالفت کی لیکن سائنسی برادری نے اِن مشاہدات کو قبول کر لیا:

حرفِ غَلط بن گئی عِصمتِ پیرِ کُنِشت
اور ہُوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں[1]

۱۶۲۸ء میں انگریز طبیب ولیم ہاروے (William Harvey) نے دورانِ خون کا اصول دریافت کر کے شائع کیا۔ ۱۶۵۳ء تک فرانسیسی سائنسداں بلیز پاسکل (Blaise Pascal) طبیعیات یعنی فزکس کا وہ اہم قانون دریافت کر چکا تھا جس پر ہائیڈرولک حرکت کی بنیاد ہے اور جو آج بھی "پاسکل کے قانون" کے نام سے اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

[1] اقبال، 'مسجدِ قرطبہ'، بالِ جبریل، ص ۱۳۴

سائنسی تحقیق کو انفرادی جستجو کے بجائے اجتماعی کوششوں میں تبدیل کرنے کے لیے سائنسی ادارے بھی وجود میں آ رہے تھے جن میں سے ۱۶۶۰ء میں لندن میں قائم ہونے والی رائل سوسائٹی اور ۱۶۶۶ء میں پیرس میں قائم ہونے والی سائنسی اکیڈمی (Académie des Sciences)شامل تھیں۔

جو شخص اِس میدان کا بے تاج بادشاہ بن کر اُبھرا وہ انگریز سائنسدان سر آئزک نیوٹن(Sir Isaac Newton؛ ۱۶۴۳ء سے ۱۷۲۶ء) تھا۔ اُس کی سب سے مشہور تصنیف فطرت کے ریاضیاتی اصول *(Philosophiæ Naturalis Principia Mathematica)* تھی، جو ۱۶۸۷ء میں لاطینی زبان میں شائع ہوئی۔ اِسی میں حرکت کے وہ تینوں قوانین پیش کیے گئے جو آج بھی اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں، اور جن کی وجہ سے تقریباً ڈھائی سو برس تک کائنات کو ایک میکانکی عمل کے طور پر دیکھا جاتا رہا (یہ تصوّر ۱۹۱۹ء میں آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کے رواج پانے کے بعد متروک ہُوا اگرچہ نیوٹن کے اصولِ حرکت اب بھی اپنی جگہ درست تصوّر کیے جاتے ہیں)۔

یہ تمام سائنس داں سائنسی تحقیق کو خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے اور خالص مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ مذہبی طبقے کی طرف سے سائنس کو عقیدے کی دشمن قرار دینے کی کوششیں ضرور ہوئیں لیکن وہ محض الزامات تھے جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اِس لیے سائنس اور فکر کی اِس ترقی کے ساتھ ساتھ مسیحی دنیا میں اپنے پرانے مخالف یعنی مذہبِ اسلام کو بھی اب حقیقت پسندی سے دیکھنے کا رجحان ابھرنے لگا تھا۔ اِس کے پیچھے اسلام کو دنیا سے مکمل طور پر ختم کر دینے کا صدیوں پرانا مقصد ہی کارفرما تھا لیکن اب یہ شعور پیدا ہونے لگا تھا کہ کسی بھی عقیدے کو شکست دینے سے پہلے اُس کو سمجھنا ضروری ہے۔

اب تک یورپ کے مذہبی حلقوں میں اسلام کے بارے میں جو معلومات عام تھیں وہ

محض بے سروپا مفروضوں پر مبنی تھیں، مثلاً یہ کہ مسلمان سیاروں کی پرستش کرتے ہیں اور خدا کو قادرِ مطلق نہیں مانتے۔ ۱۶۵۳ء کے بعد سے یورپی زبانوں میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں ایسی تصنیفات سامنے آنے لگیں جن میں اسلام پر تنقید کرتے ہوئے قرآن کی اصل تعلیمات کو سامنے رکھا جاتا تھا۔

اِن تصنیفات میں یہ بات خاص طور پر سامنے آئی کہ قرآن نے سائنسی اندازِ فکر کی حوصلہ افزائی کی ہے، اور خدا کی جستجو میں عقل اور تجربے کو ساتھ لے کر چلنے کے جس اصول کی مسیحی چرچ اِتنی شدید مخالفت کر رہا ہے، وہ قرآن کے بنیادی احکامات کے طور پر مسلمانوں پر شروع ہی سے فرض کر دیئے گئے تھے۔

تقریباً ہر مذہب نے روشنی کے استعارے کو اہمیت دی ہے اور بائبل میں بھی یہ استعارہ اہم تھا۔ اِس لیے یورپ میں سائنسی فکر کو فروغ دینے والے مفکر بھی سائنسی سوچ کو روشنی سے تشبیہ دے رہے تھے۔ اِن حالات میں یہ بات خاص طور پر محسوس کی گئی کہ چونکہ قرآن میں روحانی علوم کے ساتھ ساتھ عقل اور مشاہدے کے استعمال کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے اِس لیے جب قران اِس قسم کی بات کہتا ہے کہ "اللہ اُن لوگوں کا محافظ ہے جو ایمان لائے؛ وہ اُنہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے" (بقرہ، ۲۵۷)، تو روشنی کا لفظ ایک صحتمند سوچ کے وہی معنی اختیار کر لیتا ہے جو یورپ کے سائنسی دماغ اُسے دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک جگہ تو قرآن نے خاص طور پر مسیحیوں اور یہودیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

> اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول آچکا ہے، جو تمہاری کتاب کی بہت سی چھپی ہوئی باتیں ظاہر کر رہا ہے اور بہت سی باتوں سے چشم پوشی بھی کرتا ہے۔ یقیناً تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نور اور ایک روشن کتاب آچکی ہے۔

اللہ اُسی کے ذریعے اُن لوگوں کو جو اُس کی رضا کے طلبگار ہیں، سلامتی کے راستوں کی طرف رہنمائی دیتا ہے، اور وہ اُنہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، اور اپنی توفیق سے اُنہیں سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔

آگے چل کر یورپ نے اپنی ذہنی تاریخ کے اِس دَور کو جب اُس نے تعصبات سے آزاد ہو کر حقائق کا جائزہ لینا شروع کیا، "انلائٹنمنٹ" (Englightenment) کا نام دیا جس کا لفظی مطلب ہے "روشنی میں آنا" اور جو گویا اُس قرآنی وعدے کی بازگشت ہے کہ سچی ہدایت انسان کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتی ہے۔

آخری شہنشاہ

انگلستان کے معزول بادشاہ جیمز ثانی نے تاج و تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اُسے فرانس کے کیتھولک شہنشاہ لوئی چہاردہم کے علاوہ پوپ کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ۱۶۸۹ء میں جیمز نے آئرلینڈ میں ایک باغی حکومت قائم کی کیونکہ وہاں کیتھولک بڑی تعداد میں موجود تھے۔ ۱۶۹۰ء میں انگریز فوجوں سے شکست کھا کر وہ واپس فرانس چلا گیا جہاں ۱۷۰۱ء میں اُس کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے کو انگلستان کے تخت کا جائز حقدار قرار دے دیا گیا۔

اِس خطرے کے جواب میں اُسی برس پارلیمنٹ نے قانون منظور کیا کہ انگلستان کے بادشاہ کے لیے پروٹسٹنٹ ہونا لازمی ہے (یہ قانون اب بھی نافذ ہے)۔ اسکاٹ لینڈ میں بھی جیمز کے جانشینوں کے حامی موجود تھے اِس لیے ۱۷۰۷ء میں وہاں کی پارلیمنٹ کی منظوری کے ساتھ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کا الحاق عمل میں آیا جس کے بعد پورے

جزیرے کو برطانیہ عظمیٰ (Great Britain) کا نام دیا گیا، جس میں اسکاٹ لینڈ، انگلستان اور انگلستان کے حصے کے طور پر ویلز شامل ہیں۔

چونکہ اِس الحاق کے بعد اسکاٹ لینڈ کی علیحدہ بادشاہت کا وجود نہ رہا (جسے ۱۳۰۶ء میں رابرٹ بروس نے قائم کیا تھا) اور اسکاٹ لینڈ کی علیحدہ پارلیمنٹ بھی ختم کر دی گئی (اِسے ایک محدود پیمانے پر ۱۹۹۷ء میں بحال کیا گیا)، اِس لیے اسکاٹ لینڈ میں اِس الحاق کے خلاف ردِ عمل ہُوا۔ اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جیمز کے جانشینوں نے وہاں کئی بغاوتوں کو جنم دیا۔ ۱۷۴۵ء میں یہ بغاوتیں اپنے عروج کو پہنچیں لیکن برطانوی افواج نے انہیں کچل دیا اور ۱۷۴۶ء میں یہ سلسلہ عملاً ختم ہو گیا۔

برطانیہ کی طرح یورپ کے کچھ اور ممالک میں بھی کسی نہ کسی طرح کی جمہوریت نشوو نما پا رہی تھی جن میں ہالینڈ نمایاں تھا۔

جو ریاستیں اِس نئے رجحان کی اہمیت سے غافل رہیں وہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنی شان و شوکت کھونے لگیں۔ خلافتِ عثمانیہ، چین اور جاپان کی مثالیں نمایاں تھیں۔ ۱۷۱۵ء میں لوئی چہاردہم کی موت کے بعد فرانس کے سیاسی نظام پر بھی جمود طاری ہونے لگا۔

۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کی وفات کے بعد برصغیر میں بھی مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ ایک طرف بڑے بڑے صوبے عملاً خود مختار ہوئے اور صرف رسمی حد تک مغل بادشاہ کی بالادستی کو قبول کیے رکھا۔ دُوسری طرف خود مغل بادشاہ اُمرا اور جرنیلوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے۔

برصغیر میں ابھرنے والی نئی طاقتوں میں مرہٹہ سلطنت سب سے بڑا خطرہ ثابت ہوئی۔ ہمیشہ سے حکومت کے دو جواز تسلیم کیے گئے تھے۔ پہلا یہ کہ وہ قوم کی اپنی مرضی سے قائم ہوئی ہو۔ دوسرا یہ کہ طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد ملک کا اچھا

بندوبست کر کے لوگوں کی رضامندی حاصل کر لی جائے۔ اِسی دُوسرے اصول کے تحت غیر ملکی فاتحین کی حکومتیں بھی قبول کی جاتی تھیں۔ اِن دونوں طریقوں کے برعکس مرہٹوں نے یہ روش اپنائی کہ مختلف علاقوں پر دھاوا بول کر خراج وصول کرتے تھے جسے وہ "چوتھ" کا نام دیتے تھے۔ لیکن اِس کے عوض کسی قسم کا انتظامی ڈھانچہ فراہم نہیں کرتے تھے۔

اِس لیے اگرچہ مرہٹوں نے سلطنت بھی قائم کر لی اور اُسے مغل بادشاہ سے زبردستی قبول کروا کے بادشاہ کے نام پر ہی چوتھ وصول کرنے لگے لیکن پھر بھی صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندو حکمراں بھی مرہٹوں کو طاقتور لٹیروں ہی میں شمار کرتے رہے۔ عام طور پر مرہٹہ سلطنت کو ایک جائز ریاست کے بجائے خطے کے استحکام کے لیے خطرہ ہی سمجھا گیا۔

اِس کے علاوہ مرہٹوں کے چوتھ کی رقم کسی بادشاہ کے خراج سے کئی گنا زیادہ تھی۔ بادشاہ عموماً کسی علاقے کی کُل آمدنی کے دس بارہ فیصد سے زیادہ خراج نہ لیتے تھے اور اُس میں بھی اکثر و بیشتر کمی کر دی جاتی تھی تاکہ علاقے کی خوشحالی متاثر نہ ہو۔ لیکن مرہٹوں کے "چوتھ" کا مطلب تھا ایک چوتھائی یعنی پچیس فیصد۔ بعض اوقات اُس میں بھی دس فیصد کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ اِس سے ظاہر تھا کہ مرہٹوں کو ملک کی خوشحالی سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ یہ محض ایک قسم کی مجرمانہ ذہنیت تھی جس نے سر پر تاج سجا لیا تھا۔

*

اِس دوران میں فارس کی صفوی سلطنت بھی ختم ہو چکی تھی۔ پہلے وہاں بغاوتیں پھوٹیں اور پھر ۱۷۲۲ء میں شہنشاہ نے تاج و تخت باغیوں کے سپرد کر دیا۔

اُس کے بعد جو خانہ جنگی شروع ہوئی اُس میں ایک سپہ سالار سب پر چھا گیا۔ اُس کا نام

نادر قلی تھا اور مشہور ہے کہ فوج میں شامل ہونے سے پہلے وہ ایک معمولی لٹیرا تھا۔ ۱۷۲۹ء میں اُس نے تمام حریفوں کو شکست دے کر فارس کی حکومت بحال کی اور صفوی خاندان کے ایک شہزادے کو برائے نام بادشاہ بنا دیا۔ ۱۷۳۶ء میں وہ خود شہنشاہ بن گیا اور تاریخ اُسے نادر شاہ افشار کے نام سے یاد رکھتی ہے۔

۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا، جس کا سب سے مشہور واقعہ ایرانی افواج کے ہاتھوں دہلی میں قتلِ عام اور لوٹ مار ہے۔ واپسی پر نادر شاہ مغلوں کے خزانے کا ایک بہت بڑا حصہ ساتھ لے گیا جس میں تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا بھی شامل تھے۔

تاریخ کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ یہی وحشت خیز فاتح اپنے عہد کا ایک زبردست مصلح ثابت ہُوا۔ آج دنیا کے مسلمان جس شیعہ سُنی اتحاد کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اُس کا اصل بانی وہی ہے۔

صفوی حکمرانوں نے اپنے عہدِ حکومت میں فرقہ واریت کی انتہا کر دی تھی۔ نادر شاہ نے صحابہ کرامؓ کو برا بھلا کہنے (''تبرّا'') پر پابندی عائد کر دی اور بہت سے دوسرے اقدامات کے ذریعے بھی شیعہ اور سُنی فرقوں کے درمیان محبت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ صفوی اور عثمانی سلطنتوں کے درمیان فرقہ وارانہ اختلاف کی وجہ سے جو کشمکش چلی آرہی تھی، نادر شاہ نے اُسے کم کرنے کے خلافتِ عثمانیہ کے ساتھ مذاکرات کیے اور شیعہ حاجیوں کے لیے حج اور زیارت کی راہ ہموار کی۔

نادر شاہ کا سب سے دُور رَس اقدام یہ تھا کہ اُس نے اثنا عشری عقائد کو سُنّی مخالف نظریے کے بجائے ''فقہ جعفریہ'' کے طور پر تشکیل کروایا کیونکہ سُنّی بھی امام جعفر الصادق کا احترام کرتے تھے۔ اُس کے بعد اُس نے خلافتِ عثمانیہ کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ اِس فقہ کو چاروں سنی فقہوں کے ساتھ ایک پانچویں فقہ کے طور پر تسلیم کر

لیا جائے۔ کم سے کم اصولی طور پر خلافتِ عثمانیہ نے یہ بات مان لی۔

نادر کی اِنہی کوششوں کی وجہ سے علامہ اقبال نے جاویدنامہ میں اُسے جنت الفردوس کے ایک محل میں دکھایا ہے۔ مولانا روم اُس محل کی طرف اشارہ کر کے اقبال سے کہتے ہیں، "نادر، جو اتحاد کے راز سے واقف تھا، مسلمانوں کو محبت اور یگانگت کا پیغام دے گیا":

نادر آں دانائے رمزِ اتحاد　　با مسلماں داد پیغامِ وداد[1]

لیکن نادر نے اپنی حکومت کے لیے طاقت کے جس جال کو زندہ کرنے کی کوشش کی تھی اب اُس کا زمانہ گزر چکا تھا۔ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اُسے اپنے مخالفین کو اِتنی بیدردی کے ساتھ کچلنا پڑا کہ اُمرا میں ہراس پھیل گیا۔ ۱۷۴۷ء کی ایک رات وہ چپکے سے اُس کے خیمے میں داخل ہُوئے اور اُسے قتل کر دیا۔

اُس کی سانسیں رُکتے ہی اُس کی عظیم الشان سلطنت کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی:

کیا دبدبۂ نادر کیا شوکتِ تیموری
ہو جاتے ہیں سب دفتر غرقِ مئے ناب آخر[2]

---

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص ۲۰۱

[2] اقبال، بالِ جبریل، ص ۷۷

باب ۳

تقدیر کے راز

یہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عُریانی[1]

*

۱۷۴۷ء میں افغانستان کے قبائل نے ایک خواب دیکھنے والے نوجوان شاعر اور سپاہی کو بادشاہ منتخب کر لیا۔ اُس کا نام احمد شاہ ابدالی تھا۔ اُس کی تخت نشینی کو جدید افغان قومیت کا آغاز اور اُسے افغان قوم کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اُسے بھی جنت الفردوس میں بادشاہوں کے محل میں شہنشاہ نادر شاہ کے ساتھ دکھایا ہے۔ وہاں وہ اقبال اور مولانا روم سے کہتا ہے، ''ایشیا مٹی اور پانی سے بنا ہوا ایک جسم ہے، اور اُس جسم میں افغان قوم دل کی مانند ہے۔ اگر اُس میں خرابی ہو جائے تو پورا ایشیا بگڑ جاتا ہے اور اگر وہ سنبھل جائے تو پورا ایشیا درست ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب تک دل آزاد ہے، جسم بھی آزاد رہتا ہے۔ ورنہ جسم صرف ایک تنکے کی مانند ہے جو ہوا کے رحم و کرم پر ہوتا ہے'':

آسیا یک پیکرِ آب و گِل است   ملّتِ افغان در آں پیکر دل است

---

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۷۹

از فسادِ او فسادِ آسیا　　　　در کشادِ او کشادِ آسیا
تا دل آزاد است آزاد است تن　　　　ورنہ کاہے در دہِ رہِ باد است تن[1]

دُوسرے لفظوں میں جس طرح ظاہری دنیا قدرت کے اُن قوانین کے تابع ہے جنہیں سائنس کے ذریعے دریافت کیا جاتا ہے، اُسی طرح انسانی معاشرے بھی قدرت کے بعض قوانین کے تحت چلتے ہیں جنہیں دریافت کر کے انسان اپنی تقدیر خود لکھ سکتا ہے:

تُو اپنی سرنوِشت اب اپنے قلم سے لکھ
خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں[2]

اِس طرح ۱۷۴۷ء، یعنی وہ سال جب احمد شاہ ابدالی تخت نشین ہُوا، انسانی تاریخ کا وہ لمحہ قرار پاتا ہے جب ہر قوم کے ضمیر میں قدرت کے اِن قوانین کو دریافت کرنے کی آرزو بیدار ہوئی۔ صرف افغانستان کی بات نہ تھی بلکہ آج ہم جسے جدید دنیا کے طور پر پہچانتے ہیں درحقیقت وہ انہی لمحات میں تشکیل پا رہی تھی۔ یورپ میں کئی چھوٹی چھوٹی اقوام بالکل اُسی طرح اپنی آیندہ زندگی کی آہٹ سن رہی تھیں جس طرح افغانیوں نے سنی تھی۔ فرانس میں جج اور مؤرخ مونٹیسکیو (Charles Montesquieu; 1689-1755) اپنی تصنیف قانون کی روح مکمل کر رہا تھا، جو اگلے برس ۱۷۴۸ء میں شائع ہوئی (اس کا انگریزی ترجمہ *The Spirit of the Law* کے عنوان سے مشہور ہے)۔ اُس نے لکھا، ”قانون سے مراد وہ ضروری رشتے یا ضابطے ہیں جو خود چیزوں کی فطرت سے پیدا ہوتے ہیں۔“

فرانس سے بہت دُور، دہلی میں شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء سے ۱۷۶۲ء) یہی نکتہ ایک اور طرح سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پچھلے پانچ سو سال تک مسلمانوں نے شریعت کے احکام

---

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص ۲۰۸

[2] اقبال، 'محراب گل افغان کے افکار'، ضربِ کلیم، ص ۱۸۰

کو خدا کی طاقت کا اظہار سمجھا تھا لیکن آٹھ دس برس پہلے ولی اللہ نے اپنی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں خدا کے اُنہی احکامات سے خدا کے علم کو جاننے کی کوشش کا آغاز کیا تھا۔

اِس طرح زندگی مختلف قوموں میں ایسے رجحانات پیدا کر رہی تھی جو تمام ظاہری فرق کے باوجود آپس میں مربوط تھے۔ اور جس شخص کو فطرت خود تیار کر رہی تھی کہ وہ اِس ربط کو دنیا پر ظاہر کر دے، اُس کا نام رُوسو تھا۔

*

ژاں ژاک رُوسو (Jean-Jacques Rousseau; 1712 – 1778) جنیوا میں پیدا ہُوا لیکن اُس کی زیادہ تر زندگی فرانس میں گزری۔ وہ بنیادی طور پر ایک موسیقار تھا لیکن ۱۷۵۰ء میں اُس نے اپنے ایک مقالے کے ذریعے یورپ کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا جب اُس نے لکھا کہ انسان کی عظمت علم و ہنر کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اُس کے انسان ہونے کی وجہ سے ہے:

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور
چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے[1]

اپنی مزید تصنیفات اور تخلیقات کے ذریعے رُوسو نے واضح کیا کہ انسان کی اصل فطرت اُس کی عقل اور محسوسات میں نہیں بلکہ اُس کے ارادے میں مضمر ہے، اور انسان فطری طور پر نیک ہے۔ برائی کا سرچشمہ انسان کے اندر نہیں ہے بلکہ ہر برائی کسی نہ کسی طرح کے عدم تحفظ کے احساس سے جنم لیتی ہے۔ اِس لیے انسان کی روح کو عدم تحفظ کے اِس احساس سے آزاد کر کے دنیا کو ایک مثالی معاشرے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے جو برائی اور ناانصافی سے پاک ہو۔ یہ وہی تصوّرِ حیات تھا جسے بعد میں اقبال نے اسلام کا اصل تصوّرِ

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۱۹

حیات ثابت کیا۔

رُوسو نے کہا کہ انسان کا ظاہری اور شعوری ارادہ (actual will) غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن چونکہ انسان پیدائشی طور پر نیک ہے، اِس لیے ہر فرد کے باطن میں ایک حقیقی ارادہ (real will) بھی موجود ہوتا ہے جو ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ فرد خود اُس سے غافل ہو۔ یہ بالکل ویسی ہی بات تھی جیسی صوفیائے کرام کہتے آئے تھے کہ ہر انسان کے باطن میں خدا کا نور موجود ہے اگرچہ جھوٹا نفس اُس پر پردے ڈال دیتا ہے:

نور تیرا چھُپ گیا زیرِ نقابِ آگہی
ہے غبارِ دیدۂ بینا حجابِ آگہی[1]

رُوسو نے اِسی ظاہری اور باطنی ارادے کی عکاسی کے لیے ڈرامے کی ایک نئی صنف ایجاد کی، جسے میلوڈرامہ (melodrama) کہا گیا۔ اِس صنف میں کرداروں کے باطنی جذبات کو موسیقی کے ذریعے ظاہر کیا جاتا تھا اور باقی پلاٹ عام مکالموں پر مشتمل ہوتا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کم و بیش اُسی زمانے میں سندھ میں صوفی شاعر اور موسیقار شاہ عبداللطیف بھٹائی (۱۶۹۰ء–۱۷۵۲ء) نے بھی ڈرامائی شاعری اور موسیقی کے امتزاج سے ایک نئی صنف قائم کی تھی، جس میں وہ مختلف کرداروں کے باطنی تجربات کو شاعرانہ مکالموں میں پیش کرتے اور اُن کے لیے مخصوص دُھنیں (سُر) تجویز کرتے تھے۔

رُوسو نے کہا کہ فرد کی طرح قوم کی بھی ایک ظاہری رائے ہوتی ہے جو سب کی آرا کا مجموعہ (the will of all) ہوتی ہے۔ لیکن فرد کی طرح قوم کا بھی ایک حقیقی ارادہ ہوتا ہے، جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کبھی ختم ہو سکتا ہے۔ رُوسو نے اُسے عمومی ارادہ (general will) کہا۔

---

[1] اقبال، 'بچہ اور شمع'، بانگِ درا، ص ۹۴

ہوبز اور لاک نے کہا تھا کہ ریاست عوام کے درمیان ایک عمرانی معاہدے (سوشل کانٹریکٹ) کے ذریعے وجود میں آتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کسی نہ کسی حکمراں کو منتقل ہو جاتا ہے۔ رُوسو نے کہا کہ عمرانی معاہدے کے تحت عوام اپنے عمومی ارادے (general will) کو دریافت کرتے ہیں اِس لیے اقتدارِ اعلیٰ بھی کسی حکمراں کو نہیں بلکہ قوم کے اپنے عمومی ارادے کو منتقل ہوتا ہے۔ اِس طرح انسان کی وحدت کا وہی تصوّر جسے عطار، نظامی، رومی اور سعدی جیسے صوفیائے کرام نے پیش کیا تھا لیکن جسے مشرق کی زوال پذیر سوچ نے رُوحانی قسم کی خرافات میں لپیٹ رکھا تھا، رُوسو کے یہاں ایک واضح سیاسی تصوّر بن کر اُبھرا۔ جمہوریت کی تعریف یہ قرار پائی کہ یہ انسان کی اِسی وحدت یعنی عمومی ارادے کی حکومت کا نام ہے۔

لاک کی طرح رُوسو نے بھی سیاسی جماعتوں کی مذمت کی اور اُنہیں جمہوریت کی رُوح کے منافی قرار دیا۔ لیکن رُوسو نے یہ بھی کہا کہ جمہوریت کے لیے انتخابات یعنی الیکشن بھی ضروری نہیں ہیں، جیسا کہ قدیم ایتھنز میں زیادہ تر عہدے انتخاب کے بجائے قرعہ اندازی کے ذریعے طے کیے جاتے تھے۔

میکیاولی نے مذہب اور سیاست کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن رُوسو نے کہا کہ دنیا میں ہر ریاست کسی نہ کسی مذہب کی بنیاد پر ہی قائم ہوئی، اور ریاست کے استحکام کے لیے سیاست اور مذہب کی وحدت ضروری ہے۔ سیاست اور مذہب کی علیحدگی ریاست کو کمزور کر دیتی ہے جس کی مثال مغرب کی مسیحی ریاستیں تھیں۔

سیاسی اعتبار سے رُوسو نے مذہب کی چار قسمیں بیان کیں۔ قبائلی مذہب میں ایک قوم کے دیوی دیوتا دُوسری قوم کے دیوی دیوتاؤں کے خلاف ہوتے تھے۔ قومی مذہب میں سب کو ایک مخصوص دیومالائی نظام پر ایمان لانا پڑتا تھا جس کی سب سے بڑی مثال قدیم

رومنوں کی بت پرستی تھی۔ مذہب کی تیسری قسم کلیسا اور ریاست کی وہ علیحدگی تھی جس نے مسیحی ریاستوں کو کمزور کر دیا تھا۔ چونکہ انجیل نے خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست تعلق کی تعلیم دی تھی اِس لیے جب مسیحیت ایک سرکاری مذہب بنی تو ریاست کو روحانی معاملات سے علیحدہ کر دیا گیا:

کلِیسا کی بُنیاد رُہبانیت تھی　　سماتی کہاں اس فقیری میں مِیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھُڑایا　　چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہُوئی دِین و دولت میں جس دم جُدائی　　ہوَس کی امیری، ہوَس کی وزیری
دُوئی ملک و دِیں کے لیے نامرادی　　دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری[1]

دورِ حاضر کے لیے رُوسو نے مذہب کی ایک چوتھی قسم تجویز کی جسے اُس نے مدنی مذہب (civil religion) کا نام دیا اور اُس کی مثال کے طور پر پیغمبرِ اسلام کی تعلیمات اور خلفائے راشدین کے دَورِ حکومت کو پیش کیا:

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیںؐ کا　　بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری!
اِسی میں حفاظت ہے انسانیت کی　　کہ ہوں ایک جُنّیدی و اردشیری[2]

رُوسو نے کہا کہ بعض بنیادی عقائد کو نافذ کرنا ریاست کی ذمہ داری ہونی چاہیے، اور یہ عقائد خدا اور آخرت پر ایمان، عمرانی معاہدے کے مطابق عمل کرنا اور ہر مذہب کے شہریوں سے رواداری ہیں۔ بقیہ مذہبی معاملات کو خدا اور بندے کے درمیان رہنے دیا جائے جیسا کہ انجیل نے تعلیم دی تھی۔

رُوسو کی اِس تجویز اور سورۂ بقرہ کی اُن آیات کے درمیان ہم آہنگی صاف ظاہر ہے

[1] اقبال، 'دین و سیاست'، بالِ جبریل، ص ۱۶۰

[2] ایضاً

جہاں کہا گیا ہے، ”بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے، اور وہ بھی جو یہودی، نصرانی یا صابئ کہلاتے تھے–اگر وہ اللہ پر، یومِ آخرت پر ایمان لائیں، اور نیک عمل کریں، تو اُن کے لیے اُن کے رب کے ہاں اجر ہے۔ اُن پر نہ کوئی خوف ہو گا، نہ وہ غم کریں گے“ (بقرہ: ۶۲)؛ اور ”دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت اور گمراہی الگ الگ اور واضح ہو چکے ہیں“ (بقرہ: ۲۵۶)۔ اگرچہ رُوسو نے یہ نہیں کہا کہ اُس نے یہ نظام قرآن شریف سے اخذ کیا ہے (اور یورپ میں ایسی بات کہنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا جہاں صدیوں سے اسلام کے خلاف بغض پایا جاتا تھا)۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم قرآن کی ہدایات کو عملی نظام کی سطح پر اختیار کرے تو نتیجہ وہی ہو گا جو رُوسو نے پیش کیا۔

*

یورپ میں یہ ایک ایسا زمانہ تھا جب سیاسی انقلابات اور بعض دُوسرے حالات کی وجہ سے خواص کے ساتھ ساتھ عوام بھی سیاسی فلسفے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ جو لوگ پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے وہ بھی دُوسروں سے کتابیں اور پمفلٹ پڑھوا کر سنتے تھے۔ اُس ماحول میں رُوسو دوسروں سے کہیں زیادہ مقبول ثابت ہُوا۔ نہ اُس نے پیغمبروں کی طرح کوئی حواری چھوڑے، اور نہ ہی بعض دوسرے مصلحین اور مفکرین کی طرح اُسے کسی بادشاہ، اکیڈمی یا تنظیم کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ لیکن وہ اپنا پیغام کچھ اِس طرح فضا میں بکھیر گیا کہ وفات کے کچھ ہی عرصے بعد وہ ایسی اہمیت حاصل کر چکا تھا جو اِنسانی تاریخ میں پیغمبروں کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اُس کے پیش کیے ہوئے نظریات کے لیے دنیا کی کئی قوموں اور ملکوں کے لوگ اپنی جانیں قربان کرنے پر تیار ہو گئے اور آج بھی تیار ہیں۔

۱۷۹۰ء تک رُوسو اور فروغِ نُور (انلائٹنمنٹ) کے دُوسرے مفکرین کے پیغام کا

خلاصہ تین الفاظ میں کیا جانے لگا: اخوّت، مساوات، آزادی – fraternity or solidarity, equality, liberty۔ اقبال کے لحاظ سے یہی تین اُصول توحید کے اسلامی عقیدے کی عملی رُوح ہیں[1] اور پیغمبرِ اسلامؐ کی بعثت کا مقصد بھی اِنہی تینوں اصولوں کو ساری دنیا میں رائج کرنا تھا۔[2] لہٰذا اقبال کے لحاظ سے یورپ میں اِن تینوں اصولوں کی ترویج کے ساتھ اسلام کے مشن کا ایک اہم مرحلہ طے ہوتا ہے۔ قوموں کے ضمیر میں وحدت کا سامان پیدا ہو چکا تھا اور رُوسو کی سب سے اہم تصنیف عمرانی معاہدہ (The Social Contract) کے پہلے جملے کے الفاظ میں وہ وحدت ایک آتش فشاں کی طرح پھوٹ کر دنیا کے سامنے آ گئی: ”انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے۔“

تمام انسانوں کی رُوح

احمد شاہ ابدالی افغانستان کی سلامتی کے لیے ضروری سمجھتا تھا کہ افغانستان کے اطراف میں موجود بڑی بڑی سلطنتوں میں اندرونی استحکام موجود ہو۔ برصغیر کے استحکام کو مرہٹہ سلطنت کی وجہ سے جو خطرہ درپیش تھا اُسے دُور کرنے کے لیے اُن نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹہ افواج کو بھاری شکست دی، مغل بالادستی بحال کی اور واپس چلا گیا۔ لیکن برصغیر کے حکمراں اپنے باہمی جھگڑوں کے لیے یورپ کی تجارتی کمپنیوں کی افواج سے مدد لینے پر مجبور تھے، جس کے نتیجے میں بالآخر برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی

1

2

بالادستی پورے برصغیر پر قائم ہو گئی۔ مزاحمت کرنے والے مقامی حکمرانوں میں میسور کے سلطان ٹیپو کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے، جو ۱۷۹۹ء میں شہید ہوئے۔ جاویدنامہ میں نادرشاہ اور ابدالی کے ساتھ اُنہیں بھی جنت الفردوس کے محل میں دکھایا گیا ہے۔ ۱۸۵۸ء میں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو معزول کر دیا گیا:

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ
نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری[1]

اِس کے ساتھ ہی برصغیر کا اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے برطانوی پارلیمنٹ کو منتقل کر دیا گیا۔ تقریباً آدھا برصغیر براہِ راست انگریزوں کی حکومت میں تھا اور برٹش انڈیا کہلاتا تھا۔ بقیہ خطہ دیسی ریاستوں پر مشتمل تھا جن کے حکمراں انگریزوں کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ ان کی تعداد پانچ سو کے قریب تھی۔

اگرچہ شمالی امریکہ کی اکثر ریاستیں ۱۷۷۶ء میں جنگ کر کے ریاستہائے متحدہ امریکہ (United States of America) کے نام سے خودمختار ہو چکی تھی۔ پھر بھی برطانوی سلطنت پھیلتے پھیلتے انسانی تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت بن گئی۔ کینیڈا، کیریبئن مقبوضہ جات، جنوبی ایشیا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، افریقی مقبوضہ جات، ملائشیا، سنگاپور، عراق اور فلسطین سمیت دنیا کے بہت سے علاقے کسی نہ کسی وقت اِس سلطنت کا حصہ بنے۔

اِس دوران میں یورپ میں فروغِ نور کی تحریک کے زور کو دیکھتے ہوئے بعض ریاستوں کے حکمرانوں نے خود ہی تعلیمی اور قانونی اصلاحات نافذ کر دی تھیں۔ ان میں جرمن ریاست پروشیا (Prussia)، روس، اسپین اور سویڈن شامل تھے۔ جو یورپی ریاستیں وقت کا ساتھ نہ دے سکیں وہاں جمہوری انقلابات آئے۔ ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس نے سب

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۸۸

سے زیادہ شہرت حاصل کی، جس میں بادشاہ اور ملکہ کے سر کاٹ دیئے گئے۔ چند برس کی افراتفری اور خونریزی کے بعد فوجی جرنیل نپولین بوناپارٹ پہلے ایک مقبول جمہوری حکمراں کے طور پر اُبھرا اور ۱۸۰۴ء میں شہنشاہ بن گیا۔ پورے یورپ کو متحد کرنے کی کوشش میں اُس نے زبردست جنگیں لڑیں اور بہت سی فتوحات حاصل کیں لیکن ۱۸۱۵ء میں بلجئیم میں واٹرلُو کے مقام پر برطانیہ اور اُس کے اتحادی ممالک سے شکست کھانے کے بعد جلاوطن ہُوا۔ انسانی تاریخ میں وہ زمانہ گزر چکا تھا جب صرف طاقت کے زور پر سلطنت قائم کی جاسکتی۔

۱۸۱۰ء سے ۱۸۳۰ء کے عرصے میں جنوبی امریکہ میں اسپین اور پرتگال کی نوآبادیاں بھی آزاد ریاستوں میں تبدیل ہو گئیں اگرچہ وہ شمالی امریکہ کی ریاستوں کی طرح متحد نہ ہو سکیں۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۷۰ء تک یورپ میں اٹلی کی ریاستوں نے متحد ہو کر موجودہ اٹلی کو جنم دیا۔ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۱ء تک درجنوں جرمن ریاستیں بھی متحد ہو کر جرمن سلطنت بن چکی تھیں۔

*

سائنس کے میدان میں جہاں پچھلے دوڈھائی سو سال قدرت کے قوانین کو دریافت کرنے میں صرف ہوئے تھے، اب اُن قوانینِ قدرت سے کام لے کر نئی ایجادات کی گئیں۔

محدود استعمال کے لیے دُخانی انجن (steam engine) یعنی بھاپ سے چلنے والے انجن پہلے بھی بن رہے تھے لیکن ۱۷۷۵ء میں اسکاٹ انجینیئر جیمز واٹ (۱۷۳۶ء سے ۱۸۱۹ء) نے بھاپ کے انجن میں ایسی تبدیلیاں متعارف کروائیں کہ اُنہیں کئی مقاصد کے لیے استعمال کرنا ممکن ہو گیا۔ صرف پچیس تیس برسوں میں برطانیہ کی زندگی اِس طرح

تبدیل ہو گئی کہ اُسے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کہا گیا اور یہ تبدیلی یورپ کے دوسرے ممالک تک بھی پہنچنے لگی۔

دنیا پہلے کبھی اِتنی تیزی سے تبدیل نہ ہوئی تھی جس طرح اب ہو رہی تھی۔ ۱۷۹۶ء میں انگریز طبیب ایڈورڈ جینز (Edward Jenner; 1749 – 1823) نے چیچک کی ویکسین ایجاد کر کے پہلی دفعہ یہ بات ممکن بنائی کہ ایک مرض کو ہونے سے پہلے ہی دُور کر دیا جائے۔ چیچک جیسی مہلک ترین بیماری آہستہ آہستہ کم ہونے لگی اور اب دُنیا سے پوری طرح ختم ہو چکی ہے۔ ۱۸۲۵ء تک کپڑا بُننے کی مشینیں، دُخانی کشتیاں، بجلی کی بیٹری اور ریل گاڑیاں ایجاد ہو کر دُنیا کے سامنے آ چکی تھیں۔ ۱۸۳۷ء میں ٹیلی گراف کی ایجاد نے پہلی دفعہ ممکن بنایا کہ ایک مکمل پیغام کسی جسمانی سفر کے بغیر صرف چند لمحوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جائے۔ ۱۸۷۶ء میں ٹیلیفون کی ایجاد نے انسانی آواز کو بھی دور دراز جگہوں تک پہنچانے کا سامان فراہم کر دیا۔ اِس دوران میں، ۱۸۶۷ء میں، ڈائنامائٹ کی ایجاد نے انجینئرنگ اور تعمیراتی منصوبوں کو پہلے سے زیادہ محفوظ بنا دیا اگرچہ اِسی ایجاد کی وجہ سے ہتھیار بھی پہلے سے کہیں زیادہ تباہ کن ہو گئے۔

*

دنیا کے عظیم ترین ذہن اِن تبدیلیوں کو اِس بات کا اشارہ سمجھ رہے تھے کہ جس طرح قدرت کے قوانین کو صحیح استعمال کر کے یہ ایجادات کی گئی ہیں بالکل اُسی طرح انسانی زندگی کے فطری قوانین کی مدد سے اجتماعی زندگی میں وہ تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں جو سائنسی ایجادات سے کم حیرت انگیز نہ ہوں۔

جرمن فلسفی ایمانویل کانٹ (Immanuel Kant; 1724 – 1804) نے دلائل

کے ساتھ ثابت کیا کہ دنیا میں مکمل اور دائمی امن قائم کیا جا سکتا ہے۔ جرمنی ہی کے ایک اور فلسفی ہیگل(Georg Wilhelm Friedrich Hegel; 1770–1831)نے دکھایا کہ انسانی تاریخ بعض قدرتی قوانین کے تابع ہے اِس لیے آزادی انسان کی تقدیر میں لکھ دی گئی ہے۔ جرمن فلسفی شاعر گوئٹے (Johann Wolfgang von Goethe; 1749 – 1832) نے یہی خیالات دلکش پیرائے میں عوام کے سامنے پیش کیے، جن میں سب سے زیادہ اہم دو حصوں پر مشتمل ڈرامہ فاؤسٹ تھا۔ مرکزی کردار فاؤسٹ جرمن ادب میں پہلے سے ایک ایسے سائنسداں کے طور پر موجود تھا جو ممنوعہ علوم حاصل کرنے کے لیے اپنی روح شیطان کے ہاتھوں بیچ دیتا ہے، اور اپنے لیے عیش و عشرت کے حیرت انگیز سامان فراہم کرتا ہے۔ گوئٹے نے دکھایا کہ فاؤسٹ کا اصل مقصد یہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم آزاد ہو جائے۔ اِس لیے خدا بھی اُس کے قصور کو معاف کر کے اُس کی رُوح پر جنت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

اقبال نے لکھا ہے کہ گوئٹے نے اُس ڈرامے میں ”انسان کے امکانی نشو و نما کے تمام مدارج اِس خوبی سے بتائے ہیں کہ اس سے بڑھ کر کمالِ فن خیال میں نہیں آ سکتا۔“ اقبال نے اپنی ایک نظم میں دکھایا ہے کہ جنت میں گوئٹے مولانا روم کے سامنے فاؤسٹ پڑھ کر سناتا ہے اور مولانا رُوم اُسے سننے کے بعد گوئٹے سے کہتے ہیں، ”تمہاری فکر نے دل کے ایک تنہا کونے میں مقام بنایا ہے اور اِس پرانی دنیا کو دوبارہ تخلیق کیا ہے۔ تم نے انسانی جسم میں روح کی تڑپ اور جدوجہد کو دیکھ لیا ہے، جس طرح صدف میں موتی کو تخلیق ہوتے ہوئے دیکھ لیا جائے“:

فکرِ تو در کنجِ دل خلوت گزید   ایں جہانِ کہنہ را باز آفرید

سوز و سازِ جاں بہ پیکر دیدہ ئی　　　　در صدف تعمیرِ گوہر دیدہ ئی[1]

آسٹریا کے موزارٹ (Wolfgang Amadeus Mozart; 1756 – 1791) اور جرمنی کے لڈوِگ وان بیتھوون (Ludwig van Beethoven; 1770 – 1827) جیسے موسیقاروں نے مغرب کی کلاسیکی موسیقی کو ترقی دے کر اِنہی اُمنگوں کا ترجمان بنا دیا۔ بیتھوون نے اپنی آخری سمفنی (سازینے پر بنی طویل دورانیے کی موسیقی) میں ایک کورس کے ذریعے ایک ہمعصر جرمن شاعر کے مصرعے بھی شامل کر دیئے جن میں مسّرت کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا، "تمہارے اعجاز سے وہ سب پھر ایک ہو رہے ہیں جنہیں رسوم و رواج نے علیحدہ کر دیا تھا۔ تمہاری شفقت کے سائے میں تمام انسان بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔" (یہ اب یورپین یونین کا سرکاری ترانہ ہے)۔

*

اِن عظیم ہستیوں کی یہ بات درست ثابت ہوئی کہ اجتماعی زندگی میں ایسی تبدیلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں جو سائنسی ایجادات سے کم حیرت انگیز نہ ہوں۔

یورپ کے نوآبادیاتی نظام (colonialism) کا تعارف پہلے پیش کیا جا چکا ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نظام کے تحت برطانیہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت بن گیا۔ یہ درست ہے کہ اُس نظام کے تحت یورپ نے دنیا کی کمزور اقوام کو لُوٹنے اور اُن کا استحصال کرنے میں ظلم و بربریت کی نئی روایات قائم کر دیں۔ ۱۷۷۰ء کی دہائی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کی سفاک اور بے رحم پالیسی کی وجہ سے برصغیر میں بیشمار ہلاکتیں، ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ مصر میں نپولین کے حکم پر ہزاروں مسلمان ترک جنگی

---

[1] اقبال، 'جلال و گوئٹے'، پیامِ مشرق، ص ۲۴۶

قیدیوں کا قتل اور ۱۸۳۰ء کے بعد برطانیہ کی طرف سے چینیوں کو زبردستی افیون کے نشے کا عادی بنانے کا کاروبار اِس ظلم اور بربریت کی صرف چند مثالیں ہیں:

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوَس کے پنجۂ خُونیں میں تیغِ کارزاری ہے[1]

لیکن اِس بات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ یورپ کی اِنہی اقوام نے اپنی اِن تمام برائیوں کے باوجود انسانیت کی فلاح کے لیے ایسے کارنامے بھی ایجاد کیے جو اِنسانی تاریخ میں پہلے کبھی انجام نہیں دیئے جاسکے تھے۔ اور وہی کارنامے اِس بات کا ثبوت تھے کہ اجتماعی زندگی میں ایسی تبدیلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں جو سائنسی ایجادات سے کم حیرت انگیز نہ ہوں۔

انسانی تہذیب کے ابتدائی زمانے ہی سے انسانوں کو غلام بنا کر بیچا اور خریدا جارہا تھا۔ اسلام نے بھی اگرچہ تمام انسانوں کو برابر قرار دیا تھا لیکن فوری طور پر غلامی کو ختم کرنے کے بجائے صرف اُسے محدود کر کے بعض اصلاحات تجویز کی تھیں۔ اِس کا مطلب عام طور پر یہی لیا گیا ہے کہ ظہورِ اسلام کے زمانے میں انسانیت اُس منزل پر نہیں پہنچی تھی کہ غلامی کو بالکل ختم کیا جاسکتا۔ غلامی کو پوری طرح ختم کرنے کی تحریکیں پہلی دفعہ فروغِ نور (انلائٹنمنٹ) کے زمانے میں یورپ میں چلیں، اور اُن کے نتائج بھی سامنے آئے۔ ۱۷۹۴ء میں فرانس نے غلامی کو منسوخ قرار دیا اگرچہ جلد ہی نپولین نے اُسے بحال کر دیا۔

۱۸۰۷ء میں برطانیہ نے غلاموں کی خرید و فروخت پر پابندی عائد کی اور ۱۸۳۳ء میں غلامی کے خاتمے کا قانون نافذ کر دیا۔ برطانیہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر حکومت کر رہا تھا۔ اِس لیے اُس کے انسدادِ غلامی کے قانون کا اطلاق تقریباً اُن تمام علاقوں پر ہُوا۔

---

[1] اقبال، 'طلوعِ اسلام'، بانگِ درا، ص ۳۱۳

۱۸۶۳ء میں ریاستہائے متحدہ امریکہ نے غلامی کو معطل قرار دیا۔ ۱۸۸۸ء میں برازیل نے بھی غلامی کو منسوخ قرار دے دیا۔ جنوبی امریکہ کی بیشتر ریاستیں اس سے پہلے ہی یہ کام کر چکی تھیں۔ دوسری تہذیبوں میں بھی اِسی قسم کے قوانین بنے، جن کی وجہ عام طور پر یورپی اثرات تھے (جو معاشرے یورپی اثرات سے دُور تھے اُنہوں نے عام طور پر زیادہ سستی کا مظاہرہ کیا، مثلاً سعودی عرب نے ۱۹۶۲ء میں اور موریطانیہ نے سب سے آخر میں ۱۹۸۱ء میں غلامی کو منسوخ کیا)۔

اکثر مذاہب نے حالتِ جنگ میں بھی انسانی ہمدردی کو پیشِ نظر رکھنے کی تلقین کی تھی لیکن ابھی تک یہ اصول بین الاقوامی قانون کا حصہ نہیں بنا تھا۔ ۱۸۵۳ء کے لگ بھگ برطانوی مصلح فلورنس نائٹنگیل (Florence Nightingale; 1820 – 1910) نے میدانِ جنگ میں طبی امداد فراہم کرنے کے لیے اہم قدامات کر کے جدید نرسنگ کی بنیاد رکھ دی۔

۱۸۶۳ء میں رُوسو کے ہموطن انسان دوست تاجر ہنری ڈونان (Henry Dunant; 1828 – 1910) نے جنیوا میں ریڈ کراس (صلیبِ احمر) کی بنیاد رکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ جنگ زدہ علاقوں میں زخمیوں کی دیکھ بھال کی جائے۔ ۱۸۶۴ء میں ریڈ کراس تنظیم نے سوئس حکومت کے ساتھ معاہدہ کیا جسے پہلا جنیوا کنونشن کہا جاتا ہے۔ اِس معاہدے کے تحت جنگ میں زخمی ہونے والے دشمن سپاہی بھی طبی امداد کے مستحق قرار پائے۔ جلد ہی دوسری ریاستیں بھی اِس معاہدے کی پابند ہونے لگیں اور بعد میں مزید جنیوا کنونشن ہوئے، جن میں جنگ کے دوران شہری آبادیوں کو بھی تحفظ فراہم کیا گیا۔

چونکہ انفرادی غلامی کا خاتمہ ہو چکا تھا اِس لیے قدرتی بات تھی کہ سیاسی غلامی کے خاتمے کے لیے بھی عملی اقدامات کیے جاتے۔ ۱۸۳۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں لارڈ

میکالے نے بالکل واضح الفاظ میں اعلان کیا کہ برصغیر میں برطانوی پالیسی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بنا کر آزاد کر دیا جائے۔ میکالے نے کہا، "ہمارے آزاد ہونے، ہمارے مہذب ہونے کا کوئی خاص فائدہ نہیں اگر بنی نوعِ انسان کے کسی بھی حصے کی اُتنی ہی آزادی اور تہذیب کو جتنی ہمیں حاصل ہے، ہم رَشک کی نگاہ سے دیکھیں۔"[1] ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستانیوں کے نام اپنے شاہی فرمان میں اِسی اصول کو برطانوی پالیسی کی بنیاد بنا دیا۔

۱۸۶۷ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے شمالی امریکہ میں اپنے مقبوضہ جات میں سے چار صوبوں کو کینیڈا (Canada) کے نام سے ایک وفاق کی صورت دے کر اپنی حکومت قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ یہاں سے برطانوی فکر میں اِس نظریے نے جنم لیا کہ اِسی طرح برطانوی سلطنت کے تمام مقبوضہ جات کو ایک ایک کر کے آزاد کر دیا جائے تاکہ ایک دن برطانوی سلطنت آزاد اقوام کے ایک خاندان میں تبدیل ہو جائے۔ اگلی صدی میں اِس تصوّر کو دولتِ مشترکہ (Commonwealth) کا نام دیا گیا۔

*

رُوسو نے انسانی ذہن کے بجائے انسانی ارادے کی تربیت کرنے کا جو تصوّر پیش کیا تھا وہ کبھی

---

[1] لارڈ میکالے کے اِس جملے کی بازگشت اقبال کے اِس جملے میں صاف سنی جا سکتی ہے، "میرا تو یہ مذہب ہے کہ جو قوم خود آزادی کی دلدادہ ہو وہ اوروں کی آزادی کو رشک کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی..."؛ مکتوب بنام نگم مارچ ۱۹۰۶ء؛ برنی، اول، ص ۱۲۰۔ قائداعظم نے بھی ہندوستان کی آزادی کے موقع پر شاہِ برطانیہ جارج ششم کا جامِ صحت تجویز کرتے ہوئے میکالے کی اِس تقریر کو یاد کیا۔ آج ہمارے یہاں لارڈ میکالے کے خلاف جو خیالات موجود ہیں، وہ ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے بانیوں کے ذہنوں میں کبھی نہیں آئے تھے اور وہ بعد میں آنے والے ہندو انتہا پسندوں کا پروپیگنڈا ہے۔

مغرب کے تعلیمی نظام کی بنیاد نہ بن سکا۔ یہاں تک کہ اُنیسویں صدی کے آغاز میں بھی اقبال کو یہی کہنے کی ضرورت پڑی کہ اعلیٰ تعلیم "اِس غلط مفروضے پر اُستوار دکھائی دیتی ہے کہ تعلیم کا مطلب انسان کے ارادے کے بجائے اُس کے ذہن کی تربیت کرنا ہے۔"[1]

یورپی اقوام کی وہ آپس کی جنگیں اور اُن قوام کی طرف سے کمزور قوموں پر ڈھائے جانے والے وہ مظالم جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، تعلیم کی اِسی خامی کا نتیجہ تھے۔ داخلی طور پر تعلیم کی اِس خامی کا سب سے بُرا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب کے دانشور روحانی طور پر تھک گئے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، دنیا کے حالات فروغِ نور (انلائٹنمنٹ) کے اِس بنیادی مفروضے کو ثابت کر رہے تھے کہ ظاہری دنیا کی طرح انسانی زندگی بھی قدرت کے قوانین کے تابع ہے جنہیں دریافت کر کے دنیا سے ہر برائی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مغرب کے دانشور اِس بات کو دیکھنے سے قاصر تھے اور وہاں فروغِ نور کی تحریک دم توڑ رہی تھی۔

۱۸۴۰ء تک مغرب کے دانشوروں میں سے بعض فروغِ نور کی تحریک کے مخالف ہو گئے اور باقی اُس کی یہ غلط تشریح کرنے لگے کہ فروغِ نور کی تحریک کا مقصد عقل کی بنیاد پر مذہب کو مسترد کرنا تھا (آج تک علمی حلقوں میں اُس تحریک کی یہی غلط تعبیر کی جاتی ہے)۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۱۸۵۹ء میں ڈاروِن نے انسانی زندگی کے آغاز کے بارے میں سائنسی معلومات فراہم کیں جو بائبل میں بیان کیے ہوئے قصہ ٔ آدم کی مروجہ تشریحات کی تردید کرتی تھیں تو مذہب اور سائنس کی راہیں الگ ہو گئیں کیونکہ رُوسو، کانٹ اور گوئٹے جیسے طاقتور ذہن موجود نہ تھے جو سائنس اور مذہب کے درمیان وحدت کو دریافت کر سکتے۔

اِسی طرح یورپ کے غریب عوام کو محدود پیمانے پر بھی ووٹ ڈالنے کے جو حقوق مل رہے تھے، اُن کی وجہ سے مراعات یافتہ طبقے کے علاوہ روشن خیال دانشور بھی جمہوریت

1

کے مخالف ہو گئے، جیسے فرانسیسی ناول نگار اسٹینڈل (Stendhal; 1783–1842)، جس کے بارے میں اقبال نے یہ مشہور مصرعے لکھے ہیں:

اِس راز کو اک مردِ فرنگی نے کِیا فاش
ہر چند کہ دانا اِسے کھولا نہیں کرتے
جمہُوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بَندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے![1]

بھاپ کے انجن کا سب سے بڑا معجزہ یہی تھا کہ اُس نے انسانی طاقت کا متبادل فراہم کر کے غلامی کے خاتمے کو ممکن بنایا تھا کیونکہ اب غلاموں کا کام مشینوں سے لیا جا سکتا تھا۔ اِس لحاظ سے صنعتی انقلاب کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ دُنیا کو جنت بنا دیا جاتا۔ لیکن غلط تعلیم کی وجہ سے صنعتی انقلاب کے فوائد صرف سرمایہ داروں تک محدود ہو گئے اور غریبوں کے لیے دنیا جہنم کا نمونہ بن گئی۔ جرمن یہودی کارل مارکس کے ضمیر نے اِس زیادتی کے خلاف آواز بلند کی اور حیرت انگیز دُور اندیشی کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کا تجزیہ کیا۔ لیکن اُن خرابیوں کے واحد حل کے طور پر اشتراکیت یعنی کمیونزم (communism) کا انتہا پسندانہ نظریہ پیش کیا جس کی بنیاد خدا کے وجود اور انسان کی روح کی نفی پر رکھی گئی تھی۔ اِس لیے اُس میں شخصی آزادی اور اظہارِ رائے کے لیے بھی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مارکس نے تجویز کیا کہ کسی فرد کو سرمائے کی ملکیت کا حق نہیں ہونا چاہیے۔ بعد میں اقبال نے مارکس کی بصیرت کی تعریف کرنے کے باوجود اُس کے فلسفے کو ناقص قرار دیتے ہوئے کہا، ”اِس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے

[1] اقبال، ’جمہوریت‘، ضربِ کلیم، ص ۱۵۰

نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے۔ جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔"[1]

جرمن فلسفی فریڈرک نیٹشے(Friedrich Nietzsche; 1844 – 1900)نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسانی فطرت میں جو امکانات موجود ہیں، غریب عوام اُن سے یکسر محروم ہیں۔ اپنی کتاب زرتشت نے کہا(*Thus Spoke Zarathustra*) میں، جو ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۵ء کے درمیان شائع ہوئی، نیٹشے نے کہا کہ خدا کا وجود ختم ہو گیا ہے اور دنیا میں ایک سُپر مین(Superman) آنے والا ہے، یعنی ایک ایسا انسان جو انسانوں کی باقی نسل سے زیادہ ترقی یافتہ ہو گا۔ اِس نظریے نے بے رحم قوّت کی پرستش کا ایک نیا جواز فراہم کر دیا۔

۱۸۸۶ء میں ایک اور تصنیف، اچھائی اور برائی سے آگے(*Beyond Good and Evil*) میں نیٹشے نے تجویز کیا کہ جس طرح ہندوؤں میں ذات پات کا نظام قائم ہے، اُسی طرح مغرب میں بھی ذات پات پر مبنی ایک نظام تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔ یہ نظام علمی بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے تاکہ برہمنوں کی طرح یہاں بھی ایک ایسا طبقہ وجود میں آئے جو اپنے خیالات عوام پر نافذ کرے کیونکہ اونچے خیالات عوام کے درمیان جنم نہیں لے سکتے۔ جلد ہی اِس کے لیے "اشرافی انقلابیت"(aristocratic radicalism) کی اصطلاح تجویز کی گئی۔ یہ مقصد کسی نہ کسی لحاظ سے مغرب کی تمام علم و دانش کا ہدف بن گیا اور آج تک ہے۔ اقبال نے نیٹشے کے متعلق لکھا ہے، "بجائے اِس کے کہ وہ ایک ایسی روحانی راہ تلاش کرتا جو عام انسان میں بھی خدائی صفات کو اُجاگر کرے اور یوں اُس کے سامنے ایک لاانتہا مستقبل کے امکانات کھول دے، نیٹشے اپنی بصیرت کو عملی شکل دینے

---

[1] برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۵۳-۴۵۷؛ بحوالہ زمیندار، ۲۴/جون ۱۹۲۳ء

کے لیے 'اشرافی انقلابیت' جیسے منصوبوں کی طرف مائل ہو گیا۔"[1] جاویدنامہ میں اقبال نے اُسے دنیا اور جنت کے درمیان بھٹکتے ہوئے دکھایا ہے۔[2] ایک اور جگہ لکھا ہے کہ اگر نیٹشے اُن کے زمانے میں ہوتا تو وہ اُسے دکھاتے کہ انسان کا اصل مقام کیا ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبالؔ اُس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے[3]

*

فروغِ نور (انلائٹنمنٹ) کے اصول جنہیں عقل کے پھندے میں گرفتار دانشور مغرب میں مسترد کر رہے تھے، مشرق میں ایک نیا جنم لے رہے تھے۔

۱۸۶۳ء میں برصغیر کے عظیم مؤرخ سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء سے ۱۸۹۸ء) نے قومی بیداری کی تحریک کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ صوفیوں کے نزدیک نجی تعلقات، قوم کی محبت، انسانیت کی محبت، بزمِ فطرت کی محبت اور تمام کائنات کی محبت ایک ہی جذبے یعنی محبت کی مختلف منزلیں ہیں (پہلے باب کے حصے "آخری چٹان" میں روبہان بقلی کے حوالے سے یہ تصوّر پہلے پیش کیا جا چکا ہے)۔ سر سید نے کہا کہ اِسی تصوّر کے مطابق برصغیر کے لوگوں کو اپنی اپنی قوم کی بہتری کے لیے سرگرم ہونا چاہیے۔ اُس زمانے کے برصغیر میں

---

[1] Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 184

[2] اقبال، جاویدنامہ، ص ۱۷۶

[3] اقبال، بالِ جبریل، ص ۸۱۔ "مقامِ کبریا" سے عام طور پر صرف خدا کے وجود کے ثبوت مراد لے لیے جاتے ہیں جو درست نہیں ہے۔ مقامِ کبریا سے مراد وہ مقام ہے جہاں انسان کی روح خدا کی تجلیات کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اِس لحاظ سے اِسے انسان کا "اصل مقام" کہا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اقبال نے Reconstruction, pp. میں مقامِ کبریا کا ترجمہ "I am" کیا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد ممکن نہیں تھی کیونکہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے لیے کسی ایسے کنویں کا پانی بھی حرام تھا جہاں سے مسلمان بھی پانی لیتے ہوں۔ اِس لیے سرسید کی تحریک اِس بنیاد پر شروع ہوئی کہ مسلمان اور ہندو اپنی اپنی قوموں کے حالات بہتر بنائیں لیکن اِس مقصد میں ایک دوسرے کا بھرپور ساتھ دیں۔

نیٹشے نے سپر مین کا تصوّر پیش کیا تھا لیکن سرسید نے "تمام انسانوں کی رُوح" کا خواب دکھایا۔ ۱۸۷۳ء میں ایک کہانی "گزرا ہُوا زمانہ" میں اُنہوں نے دکھایا کہ آسمان سے ایک خوبصورت دلہن اُترتی ہے اور کہتی ہے، "میں ہمیشہ زندہ رہنے والی نیکی ہوں۔۔۔ میں تمام انسانوں کی روح ہوں، جو مجھ کو تسخیر کرنا چاہے انسان کی بھلائی میں کوشش کرے۔ کم سے کم اپنی قوم کی بھلائی میں تو دل و جان سے ساعی ہو۔"

برصغیر کے مسلمان چاہتے تھے کہ اُن کے اپنے تعلیمی ادارے ہوں جن کا اہتمام انگریزوں کے بجائے قوم کے اپنے ہاتھ میں ہو۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں سرسید نے علیگڑھ کالج قائم کیا۔ اُسی زمانے میں اُنہوں نے اپنے دوست اور شاگرد مولانا الطاف حسین حالی سے مسدس مدوجزرِ اسلام (۱۸۷۹ء) لکھوائی۔ جس طرح فردوسی نے شاہنامہ کے ذریعے ایران کی صدیوں پر محیط داستان عوام تک پہنچائی تھی، اُسی طرح حالی نے مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ عام مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہنچادی:

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا　　　کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسَرا کا　　　خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا

یہی ہے عبادت، یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

۱۸۸۶ء میں سرسید نے علیگڑھ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اِس کا مقصد یہ تھا

کہ پورے برصغیر کے مسلمان تعلیم اور ترقی کے تمام معاملات میں اپنے فیصلے باہمی صلاح مشورے کے ذریعے اور مکمل اتفاقِ رائے کے ساتھ کر سکیں۔ "تمام انسانوں کی روح" کو حاصل کرنے کی جدوجہد کا آغاز ہُوا اور پرندے سیمرغ کی تلاش میں نکل پڑے۔

*

اِس طرح ۱۸۸۶ء انسانی تاریخ میں وہ سال قرار پاتا ہے جب وہ متنوع تصوّرات اپنی تکمیل کو پہنچے جو ۱۷۴۷ء سے بتدریج تشکیل پا رہے تھے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اُس برس نیٹشے نے یورپ میں ذات پات کے ایک نئے نظام کا تصوّر پیش کیا جو فروغِ نور کی تحریک کے خلاف سب سے کاری ضرب تھی اور سر سید احمد خاں نے برصغیر میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی جو فروغِ نور کے تصوّرات کو عملی شکل دینے کی سب سے بڑی کوشش کا آغاز تھی۔

لیکن ۱۸۸۶ء ہی وہ سال بھی ہے جب انگریز ادیب رابرٹ لوئی اسٹیونسن (R. L. Stevenson; 1850–1894) کا ایک مختصر ناول ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ کا عجیب و غریب معاملہ (Strange Case of Dr. Jekyll and Mr. Hyde) شائع ہُوا اور غیر معمولی طور پر مقبول ہو گیا۔ ایک نیکدل سائنسدان ڈاکٹر جیکل، انسانیت کی فلاح کے لیے کوشش کرتے کرتے ایک ایسی دوا ایجاد کر بیٹھتا ہے جو اُس کے باطن میں چھپے ہوئے بے رحم اور خبیث انسان کو بھی بیحد طاقتور بنا کر باہر لے آتی ہے۔ جدید یورپ اور بالخصوص انگریز معاشرے کے لیے اِس سے بہتر تشبیہ ممکن ہی نہیں تھی، جیسا کہ اگلی صدی میں اُردو نگار ابن صفی کے ایک کردار نے کہا، "یہ فرنگی بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اِن کی ایک ٹولی تو لوگوں پر گولیاں برساتی ہے اور دوسری ٹولی زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی پھرتی

ہے۔اِن کانشان بھی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی دو سُرخ لکیریں ہوتی ہیں!"

اُسی برس عظیم رُوسی مفکر اور ناول نگار لیو ٹالسٹائی (Leo Tolstoy; 1828 – 1910) نے اپنی تصنیف کیا کرنا چاہیے؟ بھی مکمل کی، جس میں کہا گیا کہ جس طرح دنیا سے غلامی ختم ہو چکی ہے، اُسی طرح اب غربت کو ختم کرنے کی کوشش شروع کرنی چاہیے۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ غربت ختم نہیں ہو سکتی کیونکہ یہی بات غلامی کے لیے بھی کہی جاتی تھی لیکن وہ ختم ہو گئی ہے۔ اقبال نے اِس نظریے کو اپنی تصانیف میں مزید آگے بڑھایا ہے۔ اُنھوں نے ٹالسٹائی کو بھی ایک خاص اہمیت دی ہے اور جاویدنامہ میں طاسینِ مسیحؑ پر ٹالسٹائی کا خواب پیش کیا ہے جس میں ٹالسٹائی دیکھ رہا ہے کہ مغرب کی جدید تہذیب نے حضرت عیسیٰؑ کی روح کو صلیب پر چڑھا دیا ہے۔[1]

اسکاٹ لینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک ڈاکٹر نے، جنھیں آج دنیا سر آرتھر کونن ڈائل کے نام سے یاد کرتی ہے، ۱۸۸۶ء ہی میں اپنا پہلا ناول مکمل کیا، جو اگلے برس شائع ہُوا اور جس میں سراغرساں شرلک ہومز کے ذریعے یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ "جب آپ ناممکنات کو نکال دیں تو جو کچھ باقی بچتا ہے وہی سچ ہوتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی ناقابلِ یقین کیوں نہ ہو۔" اِسی منطق کو استعمال کر کے سائنس نے تمام ترقی کی تھی۔ اب ڈائل نے اِسے تمام انسانی معاملات میں نافذ کرنے کا سامان بھی فراہم کر دیا تھا۔

اسی برس مولانا حالی کی مسدس کا دُوسرا اور حتمی ایڈیشن شائع ہُوا اور حالی نے آنحضورؐ کو مخاطب کر کے وہ نعت بھی پیش کی جو برصغیر کے مسلمانوں کی نئی زندگی کا عنوان بن گئی:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
اُمّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

1

فرانسیسی مصنف رینان نے چار برس پہلے، ۱۸۸۲ء میں، "قوم کیا ہے؟" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ اب وہ اُس کی کلیات کی پہلی جلد میں شامل ہو کر محفوظ ہو گیا۔ رینان نے اِس نظریے کو غلط اور تباہ کن قرار دیا تھا کہ قوم کی بنیاد وطن، زبان یا نسل ہوتی ہے۔ اُس نے کہا کہ قوم ایک روحانی اصول ہے، جو صرف دو چیزوں پر مبنی ہے۔ پہلی یہ کہ ماضی میں مشترکہ طور پر کارنامے انجام دیئے ہوں۔ دوسری یہ کہ مزید کارنامے انجام دینے کے لیے اکٹھے رہنے کا عزم ہو۔ اگر کبھی بھی کسی خطے کی خود مختاری کا فیصلہ کرنا ہو تو فیصلہ اُسی خطے کے لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دینا چاہیے۔ رُوسو نے جس اجتماعی ارادے کا تصوّر پیش کیا تھا، رینان نے اُسے بین الاقوامی قانون کی بنیاد بنانے کا سامان فراہم کر دیا۔

۱۸۸۶ء ہی میں فرانسیسی حکومت نے انجینئر گستاو آئفل کی طرف سے پیش کیا ہُوا ہزار فٹ سے زیادہ اونچے لوہے کے ٹاور کا نقشہ منظور کیا۔ دو تین برس بعد تعمیر ہونے والا آئفل ٹاور اُس وقت تک انسان تاریخ کی سب سے اونچی تعمیر اور گزشتہ صدی کی سائنسی ترقی کی علامت تھا۔

برطانیہ میں اُس برس عام انتخابات ہوئے۔ پچھلے برس ہی ہندوستان میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ایک تنظیم بنائی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کے ساتھ مل کر ہندوستان کے لیے سیاسی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ کانگریس کے پارسی رہنما دادابھائی نوروجی نے انگلستان کی لبرل پارٹی کے اُمیدوار کے طور پر لندن کے حلقے فنسبری سے انتخاب لڑا۔ برصغیر کے مسلمان اگرچہ عام طور پر کانگریس کے حامی نہیں تھے لیکن اُنھوں نے بھی نوروجی کی حمایت کی۔ انگلستان میں نوروجی کے حامیوں میں فلورنس نائٹنگیل بھی شامل تھیں۔ نوروجی نے اپنے حلقے کے انگریز ووٹروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

یہاں کھڑے ہو کر پچیس کروڑ ہندوستانیوں کی نمایندگی کرتے ہوئے، جو آپ ہی کی طرح سلطنتِ برطانیہ کی رعایا ہیں، بیشک میں اپنی ذمہ داری سے خوب واقف ہوں۔ یعنی اگر میں کامیاب ہُوا تو میرا پہلا فرض یہ ہو گا کہ میں اِس حلقے کے مفادات کو پوری طرح سامنے رکھوں۔ فی الحال مَیں ہندوستان کے مفادات پیش کرنا نہیں چاہتا۔

اگرچہ نوروجی اِس دفعہ کامیاب نہیں ہوئے (اُنہیں ۱۸۹۲ء کے انتخاب میں کامیابی حاصل ہوئی)۔ لیکن تب بھی انگلستان کی ایک بڑی سیاسی جماعت کی طرف سے اُنہیں ٹکٹ ملنا اور ہندوستانیوں کا نمایندہ ہونے کے باوجود اُن کا برطانوی عوام کے مفادات کی پیروی کرنے کا عزم ایک ایسا واقعہ تھا جو حاکم اور محکوم قوموں کے درمیان باہمی اعتماد کی ایک نئی مثال قائم کرتا تھا۔ یہی اِس بات کا سب سے بڑا ثبوت تھا کہ دولتِ مشترکہ کا خواب ایک دن حقیقت بن سکتا ہے یعنی دنیا کی سلطنتیں آزاد قوموں کے خاندان میں تبدیل ہو جائیں اور تمام انسانوں کی روح ایک حقیقی وجود کی طرح دنیا میں ظاہر ہو جائے۔

اتفاق سے اُسی برس برطانیہ کے سیکرٹری آف اسٹیٹ نے بھی وہ قدم اُٹھایا جس نے دولتِ مشترکہ کے ادارے کو باقاعدہ وجود دے دیا۔ اُس نے تمام برطانوی نوآبادیوں کے نمایندوں کو دعوت دی کہ وہ اگلے برس لندن میں نوآبادیاتی کانفرنس (Colonial Conference) میں شریک ہوں تاکہ سلطنت کے بعض امور اُن سب کے صلاح مشورے سے طے کیے جا سکیں۔ آگے چل کر وہی کانفرنس دولتِ مشترکہ کی پہلی کانفرنس ثابت ہوئی۔

اِس طرح وہ تمام رجحانات جو آج ہماری دنیا کو تشکیل دے رہے ہیں، واضح تصوّرات کے طور پر ۱۸۸۶ء تک سامنے آ چکے تھے۔ اُن میں اچھے رجحانات بھی شامل تھے اور برے

بھی۔ ۱۸۸۷ء سے اُن تصوّرات کے حقیقت بننے کے عمل کا آغاز ہُوا۔

نیا انسان

۱۸۸۷ء سے انسانیت کے اُس سفر کا آغاز ہوتا ہے جس کی تکمیل ہمارے عہد میں ہو رہی ہے۔ اِس سفر کو سات مراحل میں تقسیم کر کے سمجھنا آسان ہے اِس لیے اِس دَور کی باقی کہانی کو اِنہی مراحل میں تقسیم کیا جا رہا ہے۔

پہلا مرحلہ
۱۸۸۷ء سے ۱۹۰۶ء

۱۸۸۷ء ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی کا سال تھا کیونکہ وہ پچاس برس پہلے انگلستان کے تخت پر بیٹھی تھیں۔ اُس برس تمام برطانوی نوآبادیوں کے نمایندے جشن منانے لندن میں اکٹھے ہوئے تو پہلی نوآبادیاتی کانفرنس بھی منعقد ہوئی جس کے دعوت نامے پچھلے برس جاری کیے جا چکے تھے۔ یہ انسانی تاریخ میں پہلا موقع تھا کہ ایک ایسی وسیع سلطنت کے بعض فیصلے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ممالک سے آنے والے نمایندوں نے مشاورت کے ذریعے طے کیے۔

یہ اگر برطانوی معاشرے کے اُس روشن پہلو کی ایک مثال تھی جسے اسٹیونسن کی کہانی کے حوالے سے ڈاکٹر جیکل کہا جا سکے تو اُسی معاشرے کا وہ تاریک پہلو بھی دنیا کے سامنے موجود تھا جسے بے ضمیر مسٹر ہائیڈ سے تشبیہ دی جا سکتی تھی۔ اگلے بیس برسوں میں اُس کی سب سے زیادہ مکروہ صورت افریقہ میں دیکھی گئی۔ تیروں اور نیزوں سے مسلح افریقی

قبائل کے خلاف انگریزوں نے جدید ترین ہتھیار استعمال کیے، جنگ کے بعد عورتوں اور بچوں کو بھی بربریت کا نشانہ بنایا، اور جنگ کے وہ بین الاقوامی قوانین بھی بالائے طاق رکھ دیئے جو مہذب دنیا میں رائج ہوتے جا رہے تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے جاویدنامہ میں برطانوی سپہ سالار لارڈ کچنر کو، جس نے ۱۸۹۸ء میں سوڈان فتح کیا، دورِ جدید کا فرعون قرار دیا ہے اور کہا ہے، "روح کے نور کے بغیر حکومت ناپختہ ہوتی ہے۔ جو بادشاہت یدِ بیضا نہ رکھتی ہو، وہ حرام ہے":

حاکمی بے نورِ جاں خام است خام　　　بے یدِ بیضا ملوکیت حرام[1]

اُنہی برسوں میں مغربی استعمار کے پہلو سے صیہونیت (Zionism) بھی جنم لے رہی تھی۔ یورپ میں صدیوں تک مسیحیوں نے یہودیوں کے ساتھ جو برا سلوک روا رکھا تھا اُس کا سلسلہ انگلستان جیسے ترقی یافتہ ممالک میں تو قریباً ختم ہو چکا تھا لیکن روس اور مشرقی یورپ میں جاری تھا۔ ۱۸۹۶ء میں آسٹریا-ہنگری کے یہودی صحافی اور مصنف تھیوڈور ہرزل (Theodor Herzl; 1860 – 1904) نے اپنی تصنیف یہودیوں کی ریاست (The State of the Jews) میں لکھا کہ یہودیوں کے لیے اپنے حقوق حاصل کرنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ وہ اپنی ایک ریاست قائم کریں۔ اِس مقصد کے لیے ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے ایک شہر میں صیہونی تنظیم قائم کی گئی۔ برطانیہ نے فلسطین میں ایک یہودی ریاست کے قیام کو سلطنتِ عثمانیہ اور دنیائے اسلام کے سیاسی استحکام کو کمزور کرنے کا ذریعہ سمجھ کر اِس منصوبے کی حوصلہ افزائی کی لیکن فلسطینیوں کی اپنی رضامندی زیرِ بحث نہیں آئی:

تری دَوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں

[1] اقبال، جاویدنامہ، ص ۱۰۸

فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے[1]

*

۱۸۸۷ء سے ۱۹۰۶ء کے درمیان ہونے والی ایجادات میں گراموفون (۱۸۸۷ء)، ابتدائی خاموش سنیما (۱۸۹۵ء کے لگ بھگ)، ایکس رے (۱۸۹۵ء)، تاربکاری (۱۸۹۶ء) اور ہوائی جہاز (۱۹۰۳ء) شامل تھے۔ موٹر کار جو ۱۸۸۶ء میں ایجاد ہو چکی تھی، اُس کا استعمال بھی اِسی زمانے میں ۱۸۹۳ء کے بعد شروع ہُوا۔

نئی ایجادات بدستور مغرب ہی میں ہو رہی تھیں لیکن جاپان انہی مصنوعات کو اپنے یہاں بنانے میں مہارت حاصل کر کے دنیا کو حیران کر رہا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں اُس کے بحری بیڑے نے کھلے سمندر میں رُوس کو شکست دے کر ثابت کر دیا کہ ایک چھوٹا سا مشرقی ملک بھی ایک بہت بڑی یورپی سلطنت کو شکست دے سکتا ہے۔

اِس دوران میں سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء سے ۱۸۹۷ء) جیسے مفکرین مسلم معاشروں میں بھی بیداری کی لہر پیدا کر رہے تھے۔ لیکن اسلامی دنیا میں اِس بیداری کی سب سے زیادہ موٴثر صورت برصغیر میں نظر آ رہی تھی جہاں سرسید کے اثر سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور اُس جیسی دوسری تنظیموں کے اجلاسوں میں صرف پڑھے لکھے ہی نہیں بلکہ ان پڑھ عوام بھی دُور دراز سے کھنچے چلے آتے تھے اور اصلاحی نظمیں، لیکچر اور قومی تعلیم کے بارے میں تقریریں سنتے تھے۔ بالکل اُسی طرح جیسے ڈیڑھ سو سال پہلے یورپ اور بالخصوص فرانس کے عوام میں فلسفیانہ مضامین سننے کا شوق پیدا ہو گیا تھا!

اِس لیے جب سرسید کی وفات کے چند برس بعد، ۱۹۰۱ء میں، علامہ اقبال (۱۸۷۷ء

---

[1] اقبال، 'فلسطینی عرب سے'، ضربِ کلیم، ص ۱۶۳

سے ۱۹۳۸ء) ایک نوجوان فلسفی شاعر کے طور پر منظرِ عام پر آئے تو دانشوروں سے پہلے عوام نے اُنہیں پذیرائی بخشی۔ ۱۹۰۴ء تک اُن کی شاعری برصغیر کے ہر مذہب کے لوگوں کے لیے ایک نئی سیاسی بیداری کی پہچان بن چکی تھی:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اِس کی یہ گلستاں ہمارا[1]

اقبال نے پہلے پہل اپنے افکار انگریزی نثر اور اُردو نظم کے ذریعے پیش کیے، اور بعد میں (۱۹۱۵ء سے) فارسی نظم کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ مغربی فکر میں جتنے نئے رجحانات پیدا ہو رہے تھے، اقبال نہ صرف اُن سے واقف تھے بلکہ اُنہیں مزید ترقی دے رہے تھے۔ اُس زمانے میں فرانسیسی مفکر ہنری برگساں (Henri Bergson; 1859 – 1941) وجدان کی اہمیت پر زور دے رہا تھا۔ امریکی ماہرِ نفسیات ولیم جیمز (William James; 1842 – 1910) نفسیات کی سائنسی بنیادیں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور وحی کے سائنسی ثبوت کی تلاش میں تھا۔ جرمن ریاضی دان آئن اسٹائن (Albert Einstein; 1879 – 1955) نظریۂ اضافیت (Theory of Relativity) مرتب کر رہا تھا جس کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ زمان اور مکان (time and space) جس طرح ہمیں دکھائی دیتے ہیں، وہ اُن کی اصل صورت نہیں ہے۔ اقبال نے آگے چل کر اِس قسم کے تمام جدید افکار میں اہم اضافے کیے اور بعض مسائل جنہیں حل کرنے میں مغربی مفکرین ناکام رہے، اُنہیں حل کر کے دکھایا۔

*

۱۹۰۶ء تک دنیا کی کئی قومیں اپنے اپنے ضمیر میں پرورش پانے والے نئے آئیڈیل کو ایک

---

[1] اقبال، 'ترانۂ ہندی' بانگِ درا، ص ۸۲

ابتدائی شکل دینے میں کامیاب ہو گئیں۔

فارس (ایران) میں اُسی برس عوام اور شیعہ علمأ کے مطالبے پر بادشاہ ایک جمہوری آئین نافذ کرنے پر مجبور ہُوا۔ ترکی اور مصر میں بھی اسی قسم کی تحریکوں نے زور پکڑا۔ انڈین نیشنل کانگرس نے اپنے سالانہ اجلاس میں دادابھائی نوروجی کی قیادت میں برطانیہ سے اِس بات کا واضح اعلان کرنے کا مطالبہ کیا کہ کینیڈا اور آسٹریلیا کی طرح ہندوستان میں بھی جمہوری حکومت قائم کی جائے گی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے، جنہیں خطرہ تھا کہ جمہوری حکومت قائم ہونے کی صورت میں وہ ہندو اکثریت کے غلام ہو جائیں گے، آپس میں مشورہ کر کے آل انڈیا مسلم لیگ قائم کی۔ یہ ایک سیاسی تنظیم تھی لیکن دوسری سیاسی جماعتوں کے برعکس یہ کسی مخصوص نظریے کی بنیاد پر قائم نہیں کی گئی تھی بلکہ اِس کا مقصد یہ تھا کہ قوم متفقہ طور پر اپنے فیصلے کر سکے، جیسا کہ پچھلی صدی کے سب سے بڑے مسلمان شاعر مرزا غالب نے کہا تھا:

آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے[1]

اُس وقت تک نو آبادیاتی کانفرنس کے چار اجلاس ہو چکے تھے لیکن محض اتفاقیہ تھے یعنی جب کبھی تمام نو آبادیوں کے نمایندے کسی اور سبب سے ایک جگہ جمع ہوئے تو کانفرنس کا اجلاس بھی ہو گیا۔ ۱۹۰۶ء ہی وہ سال ہے جب فیصلہ کیا گیا کہ اِس کانفرنس کو مستقل ادارہ بنایا جائے تا کہ اس کے اجلاس باقاعدگی کے ساتھ ہُوا کریں۔

[1] غالب کا یہ شعر نواب سلیم اللہ خاں نے مسلم لیگ کے قیام کی قرارداد پیش کرتے ہوئے پڑھا تھا۔

دُوسرا مرحلہ
۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۶ء

۱۹۰۷ء میں لندن میں نو آبادیوں کی کانفرنس ہوئی اور اُس کا نام بدل کر امپیریل کانفرنس (Imperial Conference) رکھا گیا۔ طے پایا کہ جن نو آبادیوں میں جمہوری حکومت رائج ہے اُنہیں ڈومینین (مستعمرہ) کہا جائے گا۔ لیکن جلد ہی دنیا کو ایک خوفناک امتحان سے گزرنا پڑا۔

یورپی ریاستیں ابھی تک قومیت کے جغرافیائی تصوّر پر قائم تھیں اِس لیے اُنہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ بڑے پیچیدہ دفاعی معاہدے کر رکھے تھے۔ بالآخر اِنہی دفاعی معاہدوں نے، جو بظاہر امن قائم کرنے کے لیے کیے گئے تھے، ایک علاقائی تنازعے کو پورے یورپ کی جنگ میں تبدیل کر دیا:

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکُشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہو گا[1]

۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہنے والی یہ جنگ اُس وقت یورپ کی جنگِ عظیم (Great European War) اور عالمگیر جنگ (World War) کہلائی، اور اب پہلی جنگِ عظیم (World War I) کہلاتی ہے۔ اِس میں حصہ لینے والے ممالک دو گروہوں میں تقسیم تھے۔ مرکزی طاقتوں (Central Powers) نے جنگ میں پہلی کی تھی اور اُن میں سب

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۱۵۰

سے آگے جرمنی، آسٹریا- ہنگری، سلطنتِ عثمانیہ اور بلغاریہ تھے۔ اُن کے مقابل اتحادی طاقتوں (Allied Powers) میں برطانیہ، فرانس، اٹلی، رومانیہ، سربیا، یونان، بلجئیم، مونٹی نیگرو، پرتگال، رُوس، امریکہ اور جاپان نمایاں تھے۔

جنگ میں پونے دو کروڑ سے زیادہ انسان ہلاک اور اُس سے کہیں زیادہ زخمی ہوئے۔ جنگ کی کل قیمت اُس زمانے میں دو ہزار ارب امریکی ڈالر کے قریب تھی، جو ۲۰۲۵ء میں تقریباً ۳۷۴ کھرب امریکی ڈالر کے برابر ہیں۔

*

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اِس ہولناک تباہی کے زیادہ تر نتائج مثبت تھے۔

اتحادی طاقتوں کو فتح حاصل ہوئی۔ جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی ۱۹۱۷ء میں رُوس میں لینن (Vladimir Lenin; 1870 – 1924) کی قیادت میں اشتراکی انقلاب آیا اور ایک ایسی حکومت قائم ہوئی جو خود کو مزدوروں کی حکومت کہتی تھی۔ اگرچہ اِس نظام میں بہت سی خامیاں تھیں جن کی وجہ سے بالآخر ۱۹۹۱ء میں اِسے مسترد کر دیا گیا۔ لیکن تب بھی دنیا بھر کے مزدوروں، کسانوں اور غریبوں میں اپنی اہمیت کا احساس بیدار ہونے لگا:

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے[1]

۱۹۱۸ء میں امریکی صدر وِلسن (Woodrow Wilson) نے چودہ نکات پیش کیے، جن کی وجہ سے پہلی دفعہ بین الاقوامی سیاست میں یہ اصول نافذ ہُوا کہ ہر قوم کسی بیرونی دباؤ کے بغیر اپنے سیاسی مستقبل اور طرزِ حکومت کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اِسے قوموں

[1] اقبال، 'خضرِ راہ'، بانگِ درا، ص ۲۹۸

کا حقِ خود ارادیت (the right to self-determination) کہا گیا۔ اس طرح مغرب میں علاقائی قومیت کا تصوّر ختم ہو گیا اور رینان کا اصول تسلیم کر لیا گیا کہ کسی بھی علاقے کے رہنے والے ہی اپنی قومیت کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ البتہ مشرقی اقوام میں مغرب کے اِس پھٹے ہوئے لباس کو پہننے کا شوق باقی رہ گیا۔

۱۹۱۸ء ہی میں امریکی مصنفہ میری پارکر فولیٹ (Mary Parker Follett; 1868 – 1931) کی تصنیف نئی ریاست (The New State) شائع ہوئی، جس میں اُس نے حیرت انگیز بصیرت سے کام لیتے ہوئے "نئی جمہوریت" کا تصوّر پیش کیا جو سیاسی جماعتوں اور الیکشن کے گورکھ دھندے سے بے نیاز تھی۔ ہندوستان میں اِس تصوّر کی حمایت کرنے والوں میں عظیم بنگالی رہنما چت رنجن داس (۱۸۷۰ء سے ۱۹۲۵ء) اور علامہ اقبال کے علاوہ ابھرتے ہوئے رہنما محمد علی جناح (۱۸۷۶ء سے ۱۹۴۸ء) شامل تھے جو بعد میں قائداعظم کہلائے۔

سلطنتِ عثمانیہ کے مقبوضہ علاقے جنگ کے دوران اُس کے ہاتھ سے نکل گئے اور جنگ کے بعد خلیفہ نے ترکی بھی اتحادی طاقتوں کے حوالے کر کے سلطنتِ عثمانیہ کو ختم کر دیا۔ لیکن ترک عوام اور فوج نے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں، جسے بعد میں اتاترک کہا گیا، اپنا ملک بیرونی حملہ آوروں سے واپس لے لیا:

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹُوٹا تو کیا غم ہے
کہ خُونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحَر پیدا!
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا![1]

---

[1] اقبال، 'طلوعِ اسلام'، بانگِ درا، ص ۳۰۶-۳۰۵

۱۹۲۳ء میں ترکوں نے خلیفہ کا منصب منتخب پارلیمنٹ کے سپرد کر دیا، جسے اقبال نے اسلام کی اصل روح سے ہم آہنگ قرار دیا۔[1]

*

سائنس کے میدان میں اُن دنوں آئن اسٹائن کے نظریات مقبول ہو رہے تھے۔ سنیما کا رواج بڑھ رہا تھا اگرچہ ابھی تک فلمیں بے آواز تھیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد ریڈیو بھی متعارف ہو گیا۔ ہوائی جہاز، موٹر کار اور میڈیکل سائنس نے مزید ترقی حاصل کی۔

زمانے کی مثبت تبدیلیوں کو واضح کرنے میں اقبال سب سے آگے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں انہوں نے لکھا، "یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اُس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔"

دُوسری طرف اقبال نے اِس بات سے بھی خبردار کیا کہ جنگِ عظیم سے پیدا ہونے والی مایوسی کی وجہ سے یورپ کے دانشور اِس قابل نہیں رہے کہ وہ اِن مثبت تبدیلیوں کو محسوس کر سکیں۔ اِس کی ایک مثال جمعیتِ اقوام (لیگ آف نیشنز) تھی جو ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی (اسے ۱۹۴۶ء میں باضابطہ طور پر ختم کیا گیا)۔ بظاہر اِس کا مقصد دنیا میں مزید جنگوں کو روکنا تھا لیکن عملاً اِس نے "مینڈیٹ" (mandate) کا تصوّر ایجاد کیا جس سے مراد یہ تھی کہ جنگ میں جیتے ہوئے علاقوں کو کسی نہ کسی استعماری قوت کی نگرانی میں دے دیا جائے۔ اقبال نے لکھا کہ کچھ کفن چوروں نے آپس میں قبریں تقسیم کرنے کے لیے انجمن بنالی ہے:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دُزدے چند

[1] Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p.149

بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند[1]

پہلی جنگِ عظیم میں ایک انگریز کرنل ٹی ای لارنس (T. E. Lawrence; 1888 – 1935) نے، جسے لارنس آف عریبیہ بھی کہا جاتا ہے، عربوں اور فلسطینیوں کو عثمانی سلطنت کے خلاف بہکا کر ساتھ ملایا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں ایک طرف اتحادی افواج نے فلسطینیوں سے ایک آزاد وطن کا وعدہ کر کے اُن کی مدد سے یروشلم فتح کیا اور دُوسری طرف برطانیہ نے صیہونی تنظیم کو تحریر طور پر یقین دلایا کہ وہاں ایک یہودی ریاست قائم کی جائے گی۔ یہ دستاویز "۱۹۱۷ء کا اعلانِ بالفور" (Balfour Declaration 1917) کہلاتی ہے۔ جنگ کے بعد جمعیتِ اقوام نے فلسطین کو برطانیہ کی نگرانی میں دے دیا۔ فلسطینیوں کے احتجاج کے باوجود وہاں یہودی ریاست کے قیام پر غور کیا جانے لگا (جو بالآخر ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے نام سے وجود میں آئی)۔

*

اِن حالات میں طاقت کی پرستش کا رواج بڑھنے لگا۔ اٹلی اور جاپان اتحادی طاقتیں تھے یعنی پہلی جنگِ عظیم میں اُنہوں نے جارحیت کے خلاف دنیا کے دفاع میں حصہ لیا تھا۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں مسولینی (Benito Mussolini) اٹلی کا ڈکٹیٹر بنا اور ۱۹۴۳ء تک رہا۔ وہ فاشزم کے نظریے کا علمبردار تھا جس کا نصب العین قدیم رومی سلطنت کی طرح ایک نئی سلطنت بنانا تھا۔ جاپان مشرقِ وسطیٰ کی کمزور ریاستوں کو فتح کر کے جاپانی سلطنت بنانے اور مفتوحہ آبادیوں پر بدترین مظالم ڈھانے لگا۔ رُوس میں جوزف اسٹالن (Joseph Stalin) کی قیادت، جو ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۲ء تک رہی، بدترین ڈکٹیٹر شپ ثابت ہوئی جس

---

[1] اقبال، 'جمعیت الاقوام'، پیامِ مشرق، ص ۲۴۳

کے تحت دس لاکھ سے بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی، اور ایک ڈیڑھ کروڑ افراد کو جبری مشقت کے کیمپوں میں بھیجا گیا۔ ان میں سے اکثر سزائیں صرف ریاست کے نظریاتی اختلاف رکھنے یا کسی غیر پسندیدہ نسل سے تعلق رکھنے کی بنا پر دی گئیں۔

جنگ ہارنے والی مرکزی طاقتوں میں سے جرمنی کو جنگ کا ذمہ دار قرار دے کر اُس پر اِتنی سخت شرائط نافذ کی گئی تھیں کہ اُن کے ردِ عمل میں وہاں نازی ازم کا نظریہ مقبول ہونے لگا جو جرمنی کی آریائی نسل کی برتری پر مبنی تھا اور اُس کے تانے بانے نیٹشے کی فکر سے ملتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جرمن مصوّر اڈولف ہٹلر نازی پارٹی کا سربراہ بنا اگرچہ اگلے بارہ برس تک وہ اقتدار میں نہ آسکا۔

۱۹۱۶ء میں یعنی پہلی جنگِ عظیم کے دوران ہی برصغیر میں مسلم لیگ اور کانگریس باہمی مشاورت کے بعد اِس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ برصغیر کی آزادی کا راز مسلمانوں کو ایک علیحدہ سیاسی وجود تسلیم کرنے میں ہے:

ربط و ضبطِ ملّتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اِس نکتے سے اب تک بےخبر[1]

۱۹۱۶ء میں دونوں جماعتوں نے اِسی اصول کی بنیاد پر سمجھوتہ کیا اور واقعی ۱۹۱۹ء تک برطانیہ کے وزیرِ ہند اور بادشاہ دونوں کو وعدہ کرنا پڑا کہ اگلے آئین کے تحت، جو دس برس میں متوقع تھا، ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے حوالے کر دی جائے گی۔

بدقسمتی سے اِس موقع پر موہنداس کرمچند گاندھی (۱۸۶۹ء سے ۱۹۴۸ء) ہندوستان کی سیاست میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ جنوبی افریقہ میں گزار کر بین الاقوامی شہرت حاصل کی تھی اور ہندوؤں میں اُنہیں ایک "مہاتما" یعنی زبردست

[1] اقبال، 'خضرِ راہ'، بانگِ درا، ص ۳۰۱

روحانی شخصیت کی حیثیت حاصل تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ اگر عوام حکومت کی نافرمانی کریں لیکن تشدد سے کام نہ لیں تو صرف ایک برس میں آزادی مل جائے گی۔ ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی لیکن پہلے دن سے ہی اس میں تشدد کے بیشمار واقعات دیکھنے میں آئے۔ برصغیر کے مسلمان ترکی اور فلسطین کو اتحادیوں کے تسلط سے آزاد کروانے کے لیے تحریکِ خلافت چلا رہے تھے، جس کے قائد مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء سے ۱۹۳۱ء) اور اُن کے بھائی مولانا شوکت علی (۱۸۷۳ء سے ۱۹۳۸ء) تھے، اِس لیے انہوں نے بھی گاندھی کا ساتھ دیا۔ لیکن ایک سال سے زیادہ مدت گزرنے پر بھی آزادی حاصل نہ ہوئی۔ ۱۹۲۲ء میں گاندھی نے تحریک ختم کر دی۔

کانگریس کے پرانے رہنما اعتدال پسند (moderate) کہلاتے تھے۔ اُنہوں نے ۱۹۱۸ء میں یہ کہہ کر کانگریس چھوڑ دی تھی کہ گاندھی اُن انگریزوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں جو ہندوستان کی غلامی کی مدت میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ہندوؤں کی سیاسی قیادت مکمل طور پر اُسی قسم کی ڈکٹیٹر شپ میں تبدیل ہو گئی جیسی یورپ میں فروغ پا رہی تھی۔ اگرچہ وہاں ہتھیاروں سے کام لیا جاتا تھا اور گاندھی دوسرے ہتھکنڈوں سے کام لیتے تھے لیکن دونوں میں یہ قدرِ مشترک تھی کہ باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے مسائل کے حل تلاش کرنے کے بجائے کسی فردِ واحد کو عقلِ کل سمجھا جائے خواہ وہ مسولینی ہو یا گاندھی! ۱۹۲۶ء تک ہندو معاشرے کی سیاسی قیادت مکمل طور پر انتہا پسند رہنماؤں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور ہندو مسلم فسادات عام ہو گئے:

یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا
یا بحث میں اُردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے[1]

---

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۳۲۸

۱۹۲۶ء ہی میں لندن میں امپیریل کانفرنس کے اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ برطانوی سلطنت کے تمام ڈومینین آزاد، خود مختار اور برابر ہیں، اور اپنی مرضی سے "اقوام کی برطانوی دولتِ مشترکہ" (British Commonwealth of Nations) کے رکن ہیں۔ اِس طرح برطانوی سلطنت کو آزاد ریاستوں کے خاندان میں تبدیل کرنے کا آئیڈیل پوری طرح واضح ہو کر سامنے آ گیا۔

تیسرا مرحلہ

۱۹۲۷ء سے ۱۹۴۶ء

اُس وقت تک برطانیہ نے جتنی نو آبادیوں کو ڈومینین اسٹیٹس دیا تھا وہ سب سفید فام حکومتوں پر مشتمل تھیں یعنی کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، نیو فاؤنڈ لینڈ اور آئرلینڈ۔ اصل سوال یہ تھا کہ کیا دوسری قومیں بھی اِس برادری میں شامل ہو سکتی ہیں تاکہ برطانوی سلطنت صحیح معنوں میں آزاد قوموں کا ایک خاندان بن جائے اور تاریخ میں سیاسی غلامی کا خاتمہ ہو جائے؟

اِس سوال کا جواب ہندوستان کو دینا تھا لیکن وہاں ہندو اکثریت کی قیادت جن رہنماؤں کے ہاتھوں میں آ چکی تھی، اُن کے بارے میں کانگریس کے بانیوں کی یہ بات درست ثابت ہوئی کہ وہ حقیقت میں ہندوستان کو غلام رکھنا چاہتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہندو انتہا پسندوں کو خوف ہے کہ اگر انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے تو یہاں کے مسلمان دوسرے مسلمان ممالک کو ساتھ ملا کر دوبارہ اپنی حکومت قائم کر لیں گے جس طرح ماضی میں کئی صدیوں تک حکومت کر چکے ہیں۔ اِس لیے بظاہر ہندو رہنما انگریزوں کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کرتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ انگریزوں کو بلیک میل کر کے

صرف اِس بات پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ انگریز بدستور ہندوستان پر حکومت کرتے رہیں لیکن تمام اقلیتوں پر اونچی ذات کے ہندوؤں کی بالادستی قائم رکھیں۔ ۱۹۳۰ء سے اقبال، مولانا محمد علی جوہر، جناح اور عام مسلمان کھل کر یہ بات کہنے لگے۔

گاندھی اور اُن کے ساتھی انگریزوں کو بلیک میل کرنے کے لیے جو طریقے استعمال کر رہے تھے اُن میں ایک حلف بھی شامل تھا جو کانگریس نے ۱۹۳۰ء سے ہر برس دہرانا شروع کیا کہ ہندوستان آزاد ہونے کے بعد برطانیہ سے ہر تعلق منقطع کرلے گا یعنی دولتِ مشترکہ میں ہرگز شامل نہ ہو گا۔

*

دُوسری طرف یورپ میں بعض نئی ایجادات مقبول ہوئیں، جن میں بولنے والی فلمیں اور ٹیلی وژن نمایاں تھے۔ لیکن بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور یورپ کے اکثر ممالک جمہوریت چھوڑ کر ڈکٹیٹر شپ اپنا رہے تھے۔ ان میں جرمنی بھی شامل تھا جہاں ۱۹۳۳ء میں اڈولف ہٹلر چانسلر منتخب ہوا، جو وزیرِ اعظم کے مترادف تھا۔ جلد ہی اُس نے تمام اختیارات اپنی نازی پارٹی تک محدود کر کے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت اختیار کر لی۔ اپنے دعووں کے مطابق وہ جرمنی کو متحد کر کے یورپ میں امن قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن عملاً اُس کے اقدامات نے جنگوں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کر دیا۔

۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر جرمنی کے حملے کے جواب میں برطانیہ بھی میدان میں اُتر آیا۔ اِس طرح دُوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی۔ تقریباً چھ برس تک جاری رہنے والی یہ جنگ انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ تباہ کن جنگ ثابت ہوئی۔ اندازاً سات سے ساڑھے آٹھ کروڑ انسان ہلاک ہوئے جو اُس وقت کی کُل انسانی آبادی کا تین فیصد تھے۔

یہ جنگ یورپ، ایشیا، افریقہ اور بحر الکاہل میں لڑی گئی اور اِس میں ساٹھ سے زیادہ قوموں نے حصہ لیا۔ لڑنے والی اقوام محوری (Axis) اور اتحادی (Allied) طاقتوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ محوری طاقتوں کا مقصد ساری دنیا پر ڈکٹیٹر شپ قائم کرنا اور نسلی اصولوں کے مطابق ایک نیا نظام تشکیل دینا تھا۔ اس گروہ میں جرمنی، اٹلی، جاپان اور دنیا کے اکثر ڈکٹیٹر شامل تھے۔ شروع میں سوویت یونین (رُوس) بھی اس گروہ میں تھا لیکن ۱۹۴۱ء میں وہ اسے چھوڑ کر اتحادیوں کے ساتھ مل گیا۔

ہندوستان سے کانگریس نے، جو گاندھی کی ڈکٹیٹر شپ کے ماتحت تھی، انگریزوں پر دباؤ ڈال کر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے خلاف اپنے مطالبات منظور کروانے کے لیے عام طور پر ایسی پالیسیاں اپنائیں جو محوری طاقتوں کے حق میں جاتی تھیں۔ ان میں ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" ("Quit India") تحریک بھی شامل تھی۔ کانگریس کے ایک سابق صدر سبھاش چندر بوس نے ہٹلر کی مدد سے "آزاد ہند فوج" بنائی، جاپان کے ساتھ مل کر ہندوستان پر ناکام حملہ کیا اور جاپان کی ماتحتی میں کالے پانی کے جزائر (انڈیمان اور نکوبار) میں محوری ریاست قائم کی۔

اِن محوری طاقتوں کے مقابلے پر اتحادی قوتیں دنیا کی آزادی کا دفاع کر رہی تھیں۔ اُن میں زیادہ تر جمہوری حکومتیں اور وہ ممالک شامل تھے جن پر محوری قوتوں نے حملہ کیا تھا۔ امریکہ شروع میں جنگ سے علیحدہ رہا لیکن ۱۹۴۱ء میں وہ بھی اتحادیوں میں شامل ہو گیا۔ ہندوستان میں ہندوؤں کی انتہا پسند تنظیم ہندو مہاسبھا نظریاتی اعتبار سے محوری قوتوں کے ساتھ ہم آہنگ تھی کیونکہ اُس نے ہندوستان کی دوسری اقلیتوں پر ہندوؤں کی بالادستی کو اپنا مقصد قرار دیا تھا۔ لیکن جس طرح رُوس سیاسی مصلحت کے تحت اتحادیوں کے ساتھ شامل ہُوا تھا، ہندو مہاسبھا بھی برطانوی حکومت کی طرفدار رہی تاکہ ہندوستان

کی برطانوی فوج میں مسلمانوں کو ہندوؤں پر برتری حاصل نہ ہو جائے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے کہا کہ وہ نظریاتی طور پر محوری طاقتوں کے خلاف ہے لیکن صرف اُس صورت میں انگریزوں کا ساتھ دے گی جب انگریز اقرار کر لیں کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان میں دو آزاد ریاستیں قائم ہوں گی جن میں سے ایک ریاست اُن علاقوں پر مشتمل ہو گی جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں (اور جس کے لیے پاکستان کا نام اختیار کیا گیا)۔ انگریزوں نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا اور مسلم لیگ نے عملاً جنگِ عظیم میں حصہ نہ لیا۔ البتہ اُس نے مسلمانوں کو انگریزوں کی افواج میں شریک ہونے سے نہیں روکا اور جناح نے (جو اَب قائداعظم کہلاتے تھے)، صاف الفاظ میں کہا، ''ہم نہیں چاہتے کہ نازی یہ جنگ جیتیں۔''

۱۹۴۳ء تک محوری حملہ آوروں کا پلڑا بھاری دکھائی دیتا رہا۔ اُس کے بعد اتحادی غالب آنے لگے۔ ۱۹۴۳ء میں اٹلی میں مسولینی کی حکومت کا تختہ اُلٹا گیا اور اٹلی اتحادیوں میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۴۵ء میں مسولینی کو سزائے موت دے کر اُس کی لاش سرِ عام اُلٹی لٹکا دی گئی۔ انہی دنوں اتحادیوں نے جرمنی بھی فتح کر لیا اور ہٹلر نے خودکشی کر لی۔

۱۹۴۵ء میں امریکہ نے نیوکلئیر توانائی دریافت کرنے کے بعد جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر کچھ دنوں کے فرق سے دو ایٹم بم گرائے۔ پہلے بم کے نتیجے میں ہیروشیما کی تقریباً ستّر فیصد عمارتیں تباہ ہو گئیں، ستّر اَسّی ہزار افراد فوری طور پر اور مزید اتنے ہی لوگ تابکاری کے اثرات سے اگلے چند ماہ میں ہلاک ہوئے۔ دوسرے بم کے نتیجے میں ناگاساکی کی تقریباً چالیس فیصد عمارتیں تباہ ہوئیں، اور تقریباً چالیس ہزار افراد فوری طور پر اور مزید ستّر اَسّی ہزار اگلے چند ماہ میں ہلاک ہوئے۔ اِس تباہی کے بعد جاپان نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ اُس کے تین روز بعد ایک حادثے میں سبھاش چندر بوس کی موت

کے ساتھ آخری محوری طاقت یعنی جاپان کی سرپرستی میں قائم ہونے والی "آزاد ہند" کی حکومت بھی ختم ہو گئی۔

جنگ کے بعد اتحادی فاتحین نے محوری طاقتوں کے افسروں اور سپاہیوں پر جنگی جرائم کے تحت مقدمہ چلایا۔ یہ انسانی تاریخ میں ایک نئی مثال تھی اگرچہ فاتحین کو اِس سے مستثنیٰ رکھا گیا، مثلاً امریکہ نے ایٹم بم کے ذریعے شہری آبادیوں کو جس طرح تباہ کیا تھا اُس پر کوئی سوال نہ اُٹھایا گیا۔

*

دوسری جنگِ عظیم ختم ہو گئی لیکن ایک تباہ کن وراثت اُس نظریے کی صورت میں چھوڑ گئی جو "اقوامِ متحدہ" (United Nations) کی بنیاد ہے۔ اتحادی طاقتوں نے جنگ کے دوران اِس تنظیم کی بنیاد رکھی اور جنگ کے بعد ۱۹۴۵ء میں جمعیتِ اقوام کو ختم کر کے اِس تنظیم کو قائم کر دیا۔ اقوامِ متحدہ کا مقصد دنیا میں امن قائم رکھنا تھا لیکن امن قائم رکھنے کے لیے یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ عالمی امن کی خواہش رکھنے والی قوموں کے پاس جتنے زیادہ تباہ کن ہتھیار ہوں گے، دنیا میں اُتنا ہی زیادہ امن قائم رہے گا۔

یہ نظریہ دولتِ مشترکہ کے تصوّر کے برعکس تھا لیکن سر ونسٹن چرچل (Sir Winston Churchill; 1874 – 1965) بھی، جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ کے وزیرِ اعظم رہے تھے، اِسی نظریے کے مبلغ بن گئے۔

جنگ کے بعد اُن کی کنزرویٹو پارٹی کی جگہ لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور کلیمنٹ ایٹلی (Clement Attlee; 1883 – 1967) وزیرِ اعظم بنے تو انہوں نے بھی برطانوی سلطنت کو قائم رکھنے کے لیے کانگریس کو دوبارہ زندہ کروایا اور دسمبر ۱۹۴۶ء میں برصغیر

میں منتخب ہندوستانیوں کی ایک دستور ساز اسمبلی قائم کر دی جس کا کام ایک متحدہ ہندوستان کے لیے دستور بنانا تھا۔ بظاہر یہی کہا گیا کہ اس اسمبلی کے بنائے ہوئے دستور کو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور وہاں سے منظوری کے بعد اسے ہندوستان میں نافذ کر کے ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا۔ لیکن سب جانتے تھے کہ اِس عمل میں کم از کم دس بیس برس کا عرصہ لگ سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ عمل کبھی مکمل نہ ہوتا۔ چونکہ کانگریس سمیت پوری ہندو قیادت اِس بات پر تیار ہو گئی تھی اُس نئے آئین کے نفاذ تک انگریز برصغیر پر حکومت کریں اِس لیے عملاً ایک طویل مدت تک اور شاید ہمیشہ کے لیے انگریزوں کے برصغیر پر حکومت کا جواز پیدا ہو گیا۔

اس موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک جمہوری اقدام نے یہ منصوبہ ناکام بنا دیا۔ مسلم لیگ کے حالیہ انتخابات میں پورے برصغیر کے مسلمانوں کی تقریباً متفقہ حمایت حاصل کی تھی اور انتخاب کے بعد برصغیر کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کی اطاعت کا عہد کیا تھا۔ کانگریس کو مسلمانوں کے پانچ فیصد سے بھی کم ووٹ ملے تھے۔ اِس لیے دستور ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی تقریباً تمام نشستیں (یعنی ۷۶ میں سے ۷۳) مسلمانوں کے لیے مخصوص تھیں۔ مسلم لیگ نے اسمبلی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ برصغیر میں ہندوستان اور پاکستان کے لیے علیحدہ دستور ساز اسمبلیاں قائم کر کے متعلقہ علاقوں کا اقتدار اُن کے سپرد کر دیا جائے۔ اِس طرح برصغیر میں انگریزوں کے غیر معینہ مدت تک رہنے کی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کی اسمبلیوں کو اپنے اپنے دستور برطانوی پارلیمنٹ سے منظور کرانے کی ضرورت نہ رہے گی اور وہ اُنہیں اپنی اپنی ریاستوں میں نافذ کرنے کے لیے انگریزوں کی طاقت کے محتاج بھی نہ ہوں گے۔

اب برطانوی حکومت کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ برطانوی عوام کے سامنے یہ کہتی کہ

ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی ہندوستان کے عوام کی نمایندگی کرتی ہے۔ اِس طرح برصغیر پر انگریزوں کے قبضے کا جواز ختم ہو گیا۔

پیاسا سمندر

فروری ۱۹۴۷ء میں برطانوی وزیرِ اعظم نے اعلان کیا کہ اگلے برس تک انگریز ہندوستان چھوڑ دیں گے۔ اِس کی وجہ اُس نے صرف یہی بتائی کہ دستور ساز اسمبلی تمام جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اِس طرح ہندوستان کو آزاد کروانے کا سہرا آل انڈیا مسلم لیگ کے سر تھا۔ لیکن یہ صرف مسلم لیگ کی کامیابی نہیں تھی۔ یہ فروغِ نور (انلائٹنمنٹ) کے اِس بنیادی مفروضے کی تصدیق بھی تھی کہ انسانی دنیا بھی قدرت کے قوانین کے تابع ہے جنہیں دریافت کر کے دنیا کو جنت بنایا جا سکتا ہے:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں[1]

چوتھا مرحلہ

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۶ء

۱۴ اور ۱۵ اگست کی درمیانی رات کو پاکستان اور ہندوستان (بھارت) کی آزاد ریاستیں وجود میں

[1] اقبال، 'طلوعِ اسلام'، بانگِ درا، ص ۳۰۹

آ گئیں۔ اِس طرح برطانوی سلطنت واقعی آزاد اقوام کی ایک ایسی دولتِ مشترکہ میں تبدیل ہو گئی جس میں ہر نسل کی اقوام برابر کی حیثیت حاصل کر سکتی تھیں۔ قائداعظم نے بالکل واضح الفاظ میں کہا کہ ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر دینا چاہیے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تمام حساب بیباق ہو چکے ہیں اور ''ہم دوست بن کر الگ ہو رہے ہیں۔''

مسلم لیگ نے کسی جنگ کے بغیر انسانی تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت سے خود بھی آزادی حاصل کی تھی اور بھارت کو بھی آزاد کروایا تھا، اور شاہِ برطانیہ جارج ششم نے بھی پاکستان کے نام اپنے پیغام میں کہا، ''آپ نے باہمی رضامندی کے ذریعے آزادی حاصل کر کے دنیا کی تمام آزادی پسند اقوام کے لیے ایک مثال قائم کی ہے۔''

دُوسری طرف جاپان نے دوسری جنگِ عظیم میں شکست کھانے کے بعد امریکہ کے زیرِ اثر آ کر مئی ۱۹۴۷ء میں ایک نیا آئین اپنایا تھا۔ اُس کے تحت جاپانی قوم ''بین الاقوامی امن کی سچی خواہش رکھتے ہوئے'' جنگ کرنے کے حق سے دستبردار ہو گئی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں وسطی امریکہ کی ریاست کوسٹاریکا (Costa Rica) نے بھی ایک آئینی اصلاح کے ذریعے اپنی فوج ختم کر دی۔

اِن حالات میں اگر عالمی نظام باہمی رضامندی کے اُس اصول کو اپناتا جو جارج ششم کے مطابق پاکستان نے پیش کیا تھا، تو شاید طاقت کی بنیاد پر فیصلے کرنے کا رواج ہی ختم ہو جاتا۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطین میں اسرائیل کی ریاست قائم ہوئی جو ایک استعماری اقدام اور رضامندی کے اصول کی نفی تھی۔ علامہ اقبال پہلے ہی خبردار کر گئے تھے کہ اسرائیل کے قیام کی تجویز پیش کرنے سے مغربی اقوام کا مقصد یہودیوں کو وطن فراہم کرنا نہیں بلکہ مشرق میں ایک مستقل تنازعے کو وجود دینا ہے تاکہ آیندہ تمام جنگیں یورپ سے باہر ہی لڑی جائیں:

مقصد ہے مُلوکیّتِ انگلیس کا کچھ اور
قصّہ نہیں نارنج کا یا شہد و رُطب کا![1]

اِس طرح پاکستان اور اسرائیل کی صورت میں دو متضاد نظریات دنیا کے سامنے آئے۔ پاکستان کا نظریہ باہمی رضامندی اور اجتماعی رائے پر مبنی تھا۔ اسرائیل کا نظریہ طاقت اور زبردستی پر مبنی تھا۔

چونکہ ان میں سے دوسرا نظریہ مغربی استعمار کے مفاد میں تھا اِس لیے مغرب کے دانشوروں نے برصغیر کی آزادی کا کریڈٹ مسلم لیگ کے بجائے گاندھی اور اُن کے ساتھیوں کو دیا۔ آزادی کے موقع پر جو ہولناک فسادات ہوئے، جن میں ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ افراد ہلاک ہوئے اور تقریباً پونے دو کروڑ لوگوں نے ہجرت کی، اُس سانحے کی اخلاقی ذمہ داری بھی مغربی دانشوروں نے مسلم لیگ پر ڈال دی۔ ۱۹۵۳ء میں خود پاکستان میں مسلم لیگ سے طاقت چھین لی گئی جس کے بعد یہ جماعت آہستہ آہستہ تحلیل ہو گئی (اس نام کی موجودہ جماعتوں کا اصل مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہیں ہے)۔ اُس کے بعد حکومتِ پاکستان نے بھی مسلم لیگ کی آئیڈیالوجی ترک کے دُوسرے نظریات اپنا لیے۔

مسلم لیگ کا ورثہ اُس کے بعد بھی عوام کے دلوں میں زندہ رہا۔ اِس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ آزادی کے بعد اُردو ادب میں سب سے زیادہ مقبولیت ابن صفی (۱۹۲۸ء سے ۱۹۸۰ء) کے ناولوں کو حاصل ہوئی (مصنف کا اصل نام اسرار احمد تھا)۔ اُن ناولوں میں حکومت، قانون اور بین الاقوامی تعلقات کے اہم معاملات کو اُنہی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جا رہا تھا جو مسلم لیگ کا ورثہ اور اقبال کے فکر کا تسلسل تھے۔ ابن صفی کے مستقل کردار–احمد کمال فریدی، ساجد حمید، علی عمران، جولیانا فٹزواٹر اور دوسرے–اُس نئے انسان کی امنگوں کے ترجمان

[1] اقبال، 'شام و فلسطین'، ضربِ کلیم، ص ۱۵۹

تھے جس نے اخلاقی قوّت کے ذریعے اپنی آزادی حاصل کی تھی۔ ”میں خود کو دنیا کے ہر اَمن پسند ملک کا نمایندہ سمجھتا ہوں،“ علی عمران ایک موقع پر کہتا ہے۔ ”میرا فرض ہے کہ میں ہر ایسی چیز کو تباہ کر دُوں جس سے بنی نوعِ انسان کو خطرہ ہو۔ ہیروشیما کی بربادی کے باعث امریکی عوام نہیں بنے تھے۔ وہ تو بڑے زندہ دل لوگ ہیں۔ زندگی سے پیار کرنے والے۔ مجرم صرف حکمران ٹولے ہوتے ہیں۔“

جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی، اگرچہ ابن صفی کے ناول عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہوئے لیکن دانشوروں نے ان پر سنجیدگی سے گفتگو کرنا بھی مناسب نہ سمجھا (ابن صفی کے علمی مقام کا اعتراف ۲۰۱۰ء کے بعد شروع ہُوا ہے)۔

*

اِن باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ برصغیر کی آزادی کے بعد دنیا کی دُوسری محکوم قومیں بھی ایک ایک کر کے آزاد ہونے لگیں لیکن یہ آزادی ہمیشہ پرامن طریقوں سے حاصل نہ کی جاسکی۔ یورپ کا نوآبادیاتی نظام ختم ہونے کے بعد انسان کی وحدت کے بجائے دو عالمی طاقتیں (super powers) اُبھر آئیں۔ یہ سوویت یونین اور امریکہ تھے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۱ء تک ان دونوں کے درمیان ایک ”سرد جنگ“ (Cold War) رہی، جس سے یہ مراد تھی کہ دونوں طاقتیں ایک دوسرے پر براہِ راست حملے کے بجائے دنیا کے باقی ممالک کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا کر اور وہاں بدامنی پیدا کر کے اپنے مقاصد حاصل کرتی تھیں۔ ان میں سے کوریا (۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء)، ویتنام (۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۵ء) اور افغانستان (۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۹ء) کی جنگیں زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے مقاصد کے لیے سوویت یونین نے کمیونزم کے نظریے کو اور امریکہ نے سرمایہ دارانہ جمہوریت کو فروغ دیا۔ نئی آزاد ہونے

والی ریاستیں اپنی انفرادیت کو دریافت کرنے کے بجائے انہی دونوں نظریات میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے دونوں طاقتوں میں سے کسی ایک کے کیمپ میں شامل ہونے لگیں۔ ۱۹۴۹ء میں چین کے انقلابی رہنما ماؤزے تنگ (Mao Zedong; 1893 – 1976) کی قیادت میں عوامی جمہوریہ چین آبادی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی ریاست بن کر اُبھرا تو اُس نے بھی کمیونزم کا نظریہ اختیار کیا اور بہت عرصے تک رُوسی کیمپ میں شامل رہا (۱۹۷۱ء سے چین نے ایک تیسری طاقت کے طور پر اُبھرنا شروع کیا لیکن وہاں ایک مرکزی طاقت کی مکمل گرفت یعنی کسی نہ کسی قسم کی ڈکٹیٹرشپ اب تک قائم ہے)۔

جو ریاستیں غیر جانبدار رہنا چاہتی تھیں اُنہیں ساتھ ملا کر بھارت نے ۱۹۶۱ء میں ''تحریک عدم وابستگی'' (Non-Aligned Movement) کی بنیاد رکھی جو ۱۹۹۱ء میں سرد جنگ کے خاتمے تک جاری رہی۔ بظاہر یہ ایک خوشگوار تصوّر تھا لیکن عملاً اِس تحریک نے کوئی متبادل پیش نہ کیا اور دونوں بڑی طاقتوں کو بلیک میل کرنے کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی، جس کے ذریعے بھارت اپنا اثر رسوخ بڑھاتا رہا۔

*

سائنسی ترقی نے فطرت کے کچھ اور رازوں سے پردہ اُٹھایا اور یہ بات واقعی ممکن ہونے لگی کہ دنیا کو جنت بنا دیا جائے۔

۱۹۵۰ء کے بعد طب میں زیادہ موٴثر ادویات فروغ پانے لگیں اور ۱۹۵۳ء میں ڈی این اے (DNA) کی دریافت نے مزید اِمکانات کے دروازے کھول دیئے۔ ٹیلی وژن کے بڑھتے ہوئے رواج نے تاریخ میں پہلی دفعہ انسانوں کو اِس بات کا عادی کیا کہ وہ فاصلوں سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کو براہِ راست دیکھ سکیں۔ ۱۹۵۲ء سے کمرشل جیٹ

پروازیں، ۱۹۶۰ء سے لیزر ٹیکنالوجی اور ۱۹۶۲ء سے مواصلاتی (satellite) نظام بھی فاصلوں کو گھٹانے لگے۔

۱۹۴۷ء میں ٹرانزسٹر کی ایجاد سے الیکٹرونک دَور کا آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں تجارتی کمپیوٹر، اور ۱۹۵۷ء کے آس پاس ہارڈڈرائیو اور پروگرامنگ کی زبانوں اور مائیکروچپ جیسی ایجادوں کے ساتھ ترقی کی نئی راہیں کھول دیں (اگرچہ ابھی تک کمپیوٹر اِتنے بڑے تھے کہ ایک کمپیوٹر کو رکھنے کے لیے ایک پورا کمرہ درکار ہوتا تھا)۔

لیکن اِن تمام مفید ایجادات سے کہیں زیادہ توجہ، سرمایہ اور سرپرستی اُن شعبدوں کو حاصل تھی جو حکمرانوں کی طاقت اور شان میں اضافہ کر سکیں۔ نیوکلیئر توانائی کے پرامن استعمال کے مواقع موجود تھے لیکن بڑی طاقتوں نے اس کے بجائے ہتھیاروں کی دَوڑ میں زیادہ دلچسپی لی۔ امریکہ ۱۹۴۵ء ہی میں نیوکلیئر ہتھیار بنا چکا تھا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۴ء کے درمیان سوویت یونین، برطانیہ، فرانس اور چین بھی اِس صف میں شامل ہو گئے (کئی سال بعد ۱۹۹۸ء میں بھارت اور پاکستان، اور ۲۰۰۶ء میں شمالی کوریا بھی نیوکلیئر طاقت بنے)۔

۱۹۵۷ء میں "خلائی دَور" (Space Age) کا آغاز بھی ہو گیا جب رُوس نے پہلا مواصلاتی سیارہ خلا میں بلند کیا۔ اُس کے بعد رُوس اور امریکہ اِس میدان میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے جنون میں مبتلا ہو گئے۔ ۱۹۶۱ء میں ایک رُوسی خلاباز نے خلا میں سفر کیا اور ۱۹۶۶ء میں رُوس کا ایک خلائی جہاز چاند پر جا اُترا۔ اگرچہ اُس میں کوئی انسان سوار نہ تھا لیکن یہ ثابت ہو گیا کہ چاند تک پہنچا جا سکتا ہے۔ ابن صفی نے اپنے ناول پیاسا سمندر (۱۹۵۷ء) میں اِن سرگرمیوں کو انسان کے اصل مقصد سے فرار کے مترادف قرار دیا اور وہ اصل مقصد انسانیت کو غربت، خوف اور بیماریوں سے نجات دلانا ہے۔ ابن صفی نے ترقی یافتہ انسان کو ایک ایسے سمندر سے تشبیہ دی جو خود پیاسا ہے کیونکہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔

*

۱۹۶۶ء تک دنیا اُس سانچے میں ڈھل چکی تھی جو ۱۹۴۷ء میں نوآبادیاتی نظام کے کمزور پڑنے کے بعد سامنے آیا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہُوا اُسی برس رُوس نے چاند پر اپنا خلائی جہاز اُتارا۔ اُسی برس چین میں "ثقافتی انقلاب" (Cultural Revolution) کا انقلاب ہُوا جو دس برس تک جاری رہا، اور جس کا مقصد چین میں نظریاتی وحدت کو فروغ دینا تھا لیکن ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ سے بیس لاکھ افراد جان سے مار دیئے گئے، اور اس سے کہیں زیادہ تشدد، قید اور جبری مشقت کے شکار ہُوئے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان بہت بڑی جنگ ہو چکی تھی جس کی وجہ یہ تھی پاکستان نے کشمیر کے متنازعہ خطے میں پیش قدمی کی تھی اور جواب میں بھارت نے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاکستان پر براہِ راست حملہ کر دیا۔ بھارت کے مقابلے پر اپنے ملک کا دفاع کرنے کو پاکستانی عوام نے اپنی بہت بڑی فتح سمجھا۔ جس طرح ۱۵۸۸ء میں اسپین کے آرمیڈا کو شکست دینے کے بعد انگلستان میں تھیٹر نے عروج حاصل کیا تھا، اُسی طرح ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستان میں سنیما کے سنہرے دَور کا آغاز ہُوا۔ ۱۹۶۶ء میں پیش کی جانے والی فلم ارمان نے قوم کے دلوں میں ایسی جگہ بنائی جو آزادی کے بعد سے آج تک کسی اور ادبی یا فنی شاہکار کو حاصل نہیں ہوئی ہے۔

اُسی برس پاکستان اور بھارت کے درمیان تاشقند معاہدہ ہُوا جس میں بھارت نے پہلی دفعہ اِس بات کا اقرار کیا کہ جنوبی ایشیا کی خوشحالی کے لیے یہاں ایک سے زیادہ ریاستوں کی خودمختاری کو تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس طرح جنوبی ایشیا میں قوموں کے درمیان ایک حقیقی اتحاد کی راہ کھل گئی جو اَب تک بھارت کی ضد کی وجہ سے مسدود رہی تھی۔

بھارت میں رائج نظام اگرچہ جمہوریت کہلاتا تھا کیونکہ وہاں انتخابات کا رواج موجود

تھا۔ لیکن عملاً آزادی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو تاحیات حکمراں ہی ثابت ہوئے کیونکہ ۱۹۶۴ء میں اپنی وفات تک ہر انتخاب کے نتیجے میں وہی وزیرِ اعظم منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں اُن کی صاحبزادی اندرا گاندھی وزیر اعظم بنیں اور اِس طرح جمہوریت کے نام پر موروثی بادشاہت پوری طرح قائم ہو گئی:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہُوری لباس
جب ذرا آدم ہُوا ہے خود شناس و خود نگر[1]

چونکہ بھارت اپنے آپ کو دنیا کے سامنے ایک مثال بنا کر پیش کر تا رہا تھا اِس لیے جلد ہی دُوسرے ترقی پذیر ممالک نے بھی جمہوریت کے دھوکے میں انتخابی بادشاہت کو ہی اپنانا شروع کر دیا۔

پانچواں مرحلہ

۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۶ء

۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۶ء وہ عرصہ ہے جب دنیا کی تقریباً ہر قوم نے اُس آئیڈیل کو بے نقاب کر لیا جو کم از کم ۱۸۸۷ء سے اُس کے ضمیر میں تشکیل پا رہا تھا۔ لیکن غلط تعلیم کی وجہ سے ہر قوم اُس آئیڈیل کو پہچاننے میں ناکام رہی ہے۔

جاپان، جس نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد اپنی شکست اور تباہی پر ماتم کرنے کے بجائے اپنی اصلاح کی طرف توجہ دی تھی، اب ٹیکنالوجی اور اقتصادی ترقی میں اِتنا بڑھ گیا کہ دنیا اِسے ”اقتصادی معجزہ“ کہنے لگی۔ ۱۹۸۵ء میں پانچ بڑی معیشتوں کے درمیان ایک بڑے اقتصادی معاہدے (پلازہ اکارڈ) میں دنیا نے دیکھا کہ جس امریکہ نے کبھی جاپان پر

---

[1] اقبال، ’ابلیس کی مجلسِ شوریٰ‘، ارمغانِ حجاز، ص ۲۱۷

ایٹم بم گرائے تھے، وہی اب ایک نہتے جاپان کے ساتھ میز پر بیٹھا اپنے ڈالر کی قیمت میں کمی کروا رہا تھا۔ جاپان کی یہ ترقی اُن اصولوں کی وجہ سے تھی جنہیں میری پارکر فولیٹ نے ۱۹۲۰ء کی دہائی میں منیجمنٹ سائنسز میں رواج دیا تھا لیکن بد قسمتی سے جاپان اُن اصولوں کو زندگی کے تمام شعبوں میں رائج نہ کر سکا۔ انجانے میں وہ بین الاقوامی تجارت ہی کو ایک جنگ بنا بیٹھا۔ ۱۹۹۱ء میں اُس کے اقتصادی معجزے کے غبارے سے ہَوا نکلنا شروع ہو گئی۔

لیکن سب سے بڑا آئیڈیل جو ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۶ء کے عرصے میں عام ہُوا، وہ آزاد اقوام کے خاندانوں کی تشکیل تھا۔ اِس کی ایک بہت بڑی مثال دولتِ مشترکہ کی صورت میں پہلے ہی سے موجود تھی۔ اُس کے بعد بعض اقوام کے درمیان عسکری، تجارتی اور نظریاتی اشتراک بھی عمل میں آیا تھا، جیسے ۱۹۴۹ء میں بعض مغربی طاقتوں پر مشتمل نیٹو (NATO)، ۱۹۶۱ء میں عدم وابستگی کی تحریک اور ۱۹۶۴ء میں پاکستان، ایران اور ترکی پر مشتمل علاقائی تعاون کی تنظیم (RCD)۔ لیکن اُس قسم کے اشتراک کے پیمانے نسبتاً محدود دکھائی دیتے ہیں اگر اُن کا موازنہ ۱۹۶۷ء میں قائم ہونے والے آسیان (ASEAN) سے کیا جائے، جو پورے جنوب مشرق ایشیا کے ممالک کا اتحاد تھا (اب اس میں دس ممالک شامل ہیں)۔

۱۹۶۷ء ہی میں اسرائیل نے مصر، اُردن اور شام کو شکست دے کر تینوں ممالک کے بعض علاقے چھین لیے۔ ۱۹۶۹ء میں پچیس مسلم ممالک نے اسلامی کانفرنس کی تنظیم (OIC) قائم کی اور جلد ہی تقریباً تمام مسلم ریاستیں اس میں شامل ہو گئیں (اب یہ اسلامی تعاون کی تنظیم کہلاتی ہے)۔ صرف اگلے چھ برس میں اینڈین معاہدہ (Andean Pact)، کیریبین کمیونٹی (CARICOM) اور مغربی افریقہ کی اقتصادی برادری (ECOWAS) وجود میں آ چکے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا مشرقی علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا لیکن

۱۹۸۵ء میں اُسی بنگلہ دیش نے پاکستان سمیت جنوبی ایشیا کی تمام ریاستوں کو جنوبی ایشیائی تنظیم برائے علاقائی تعاون (SAARC) کی صورت میں متحد کر دیا اور ۱۹۸۶ء میں سارک فعال بھی ہو گیا۔

اِن میں سے ہر تنظیم رُوسو، کانٹ اور اقبال جیسے مفکرین کے اِس خواب کو حقیقت بنا سکتی ہے کہ ہر خطے کی ریاستیں اپنی اپنی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے ایک جان بن کر زندہ رہیں اور ایسی تنظیموں کے آپس کے اتحاد سے پوری دنیا ایک خاندان کی طرح ہو جائے۔ لیکن ان میں سے شاید ہی کوئی تنظیم کبھی اپنی اِس صلاحیت کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہوئی ہو:

شمعِ محفل ہو کے تُو جب سوز سے خالی رہا
تیرے پروانے بھی اس لذّت سے بیگانے رہے
رشتۂ اُلفت میں جب ان کو پرو سکتا تھا تُو
پھر پریشاں کیوں تری تسبیح کے دانے رہے[1]

*

قوموں کے ضمیر میں تشکیل پانے والے یہی آئیڈیلز قوموں کے اجتماعی خوابوں کی صورت میں بھی سامنے آ رہے تھے۔ اس لیے تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ کئی معاشروں کے لیے یہ زمانہ اُن کے سنیما کا سنہری زمانہ ثابت ہُوا کیونکہ سنیما کی تعریف ہی یہی ہے کہ وہ اجتماعی خواب ہوتا ہے۔ پاکستان میں وحید مراد (۱۹۳۸ء سے ۱۹۸۳ء) اور اُن کے مکتبِ فکر کے شاعروں، مصنفوں اور ہدایتکاروں کی مثال سب کے سامنے ہے۔ دوسرے

---

[1] اقبال، 'شمع اور شاعر'، بانگِ درا، ص ۲۰۵

معاشروں سے بھی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں یہاں تک کہ ہانگ کانگ جیسے دُور دراز ملک نے بھی بروس لی (Bruce Lee; 1940 – 1973) کی صورت میں ایک ایسی شخصیت پیش کر دی جس کا شہرہ آج تک باقی ہے۔ اُسی زمانے میں مسلمان امریکی باکسر محمد علی (۱۹۴۰ء سے ۲۰۱۶ء) جیتی جاگتی زندگی میں ایک ایسا ہیرو بن کر سامنے آیا کہ کہانیوں میں انجام دیئے جانے والے کارنامے بھی اُس کے سامنے ماند پڑ گئے:

وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی[1]

لیکن جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں بادشاہ کے درباری بادشاہ کے خواب کی تعبیر کرنے میں ناکام رہے تھے اور کہہ دیا تھا، "یہ تو پریشان خواب ہیں، اور ہم خوابوں کی تعبیر جاننے والے نہیں ہیں"، اُسی طرح علم اور دانش کے امین بھی یہ بتانے میں ناکام رہے کہ عوام کے اجتماعی خواب کن آئیڈیلز کو پیش کر رہے تھے۔ دُوسرے لفظوں میں وہ قوم کے اجتماعی ارادے (general will) کو دریافت کرنے میں ناکام رہے۔

لہٰذا اُس زمانے میں اگرچہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل سیاسی رہنما سامنے آئے جن کے ورثے آج تک زندہ ہیں، لیکن اُن میں سے اکثر متنازعہ ثابت ہوئے اور آج تک متنازعہ ہیں۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاُالحق، بنگلہ دیش میں شیخ مجیب الرحمٰن، فلسطین میں یاسر عرفات اور لیبیا میں معمر قذافی، امریکہ میں رچرڈ نکسن (Richard Nixon) اور سوویت یونین میں لیونیڈ برزنیف (Leonid Breznev) صرف چند مثالیں ہیں۔ اُس دَور کے بڑے رہنماؤں میں سے کم ہی غیر متنازعہ رہے ہوں گے، اور اُن میں سعودی عرب کے شاہ فیصل بن عبد العزیز شاید سب سے نمایاں ہیں۔

[1] اقبال، 'طلوعِ اسلام'، بانگِ درا، ص ۳۰۴

جیسا کہ توقع کی جاسکتی ہے، یہ ایسے بڑے بڑے انقلابات کا زمانہ تھا جنہوں نے دنیا کو ہِلا کر رکھ دیا اور جن کے اثرات آج تک ہمارے درمیان موجود ہیں۔ لیکن چونکہ اُن مواقع پر قیادت کرنے والے رہنما اپنی اپنی قوموں کے آئیڈیلز سے عموماً ناواقف تھے، اِس لیے باہمی رضامندی کے ذریعے حل دریافت کرنے کی مثالیں سامنے نہ آئیں۔ عام طور پر خونریز تصادم ہی دیکھے گئے۔ ۱۹۷۹ء کا انقلابِ ایران اِس کی شاید سب سے بڑی مثال ہے۔ غیر مقبول شہنشاہ کی حکومت ختم کر کے امام خمینی کی قیادت میں ایک اسلامی جمہوریت قائم کی گئی لیکن اختلافِ رائے کو ایسی سختی سے کچلا گیا جس نے آج تک ایرانی معاشرے کو اندرونی طور پر تقسیم کر رکھا ہے۔

اُس زمانے کا سب سے بڑا سیاسی واقعہ جسے اصولی طور پر غیر متنازعہ ہونا چاہیے، اتفاق سے آج سب سے زیادہ متنازعہ بن چکا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں سوویت یونین (رُوس) نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ افغان عوام اپنے وطن کے دفاع میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پاکستان نے امریکہ اور بعض دُوسرے ممالک کا تعاون حاصل کر کے افغان مجاہدین کی بھرپور مدد کی:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نِگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کُہستانی[1]

۱۹۸۹ء تک رُوسی افواج افغانستان سے واپس جانے پر مجبور ہو گئیں، جس کے نتائج اگلے مرحلے کے تحت بیان کیے جا رہے ہیں۔

*

اِسی دوران میں، ۱۹۶۹ء میں، امریکہ پہلی دفعہ ایک انسان کو چاند تک پہنچا چکا تھا۔ اس کے

---

[1] اقبال، ’محراب گل افغان کے افکار‘، ضربِ کلیم، ص ۱۸۲

بعد خلابازوں کو خلا میں بھیجنے کا سلسلہ کافی بڑھ گیا لیکن ۱۹۸۶ء میں امریکی خلائی جہاز چیلنجر (Challenger) کی تباہی میں سات خلابازوں کی ہلاکت کے بعد انسانوں کو خلا میں بھیجنے کے رجحان میں کمی آگئی۔

میڈیکل سائنس میں اس زمانے کی ایک اہم پیشرفت ۱۹۷۳ء میں جینیاتی انجینئیرنگ کا آغاز تھا۔ اگلے دس پندرہ برسوں میں ایم آر آئی (MRI) کی ٹیکنالوجی بھی سامنے آئی۔ لیکن جن ایجادات نے عوام کی زندگیوں میں سب سے زیادہ تبدیلیاں پیدا کیں اُن کا تعلق الیکٹرانک اور کمپیوٹر کے شعبوں سے تھا۔

۱۹۶۳ء میں آڈیو کیسٹ اور کیسٹ پلیئر ایجاد ہو چکے تھے لیکن ۱۹۶۷ء کے بعد اُن کا استعمال عام ہونے لگا۔ گراموفون کے برعکس، کیسٹ ایک عام انسان کو بھی اپنی آواز آسانی سے محفوظ کرنے کا موقع دیتا تھا۔ ۱۹۷۶ء میں وی ایچ ایس کیسٹ اور وی سی آر بھی ایجاد ہو گئے۔

۱۹۷۱ء میں مائیکروپروسیسر کی ایجاد نے چھوٹے سائز کے کمپیوٹرز کو ممکن بنایا اور ۱۹۷۷ء میں عام لوگوں کے استعمال کے کمپیوٹر ("پرسنل کمپیوٹرز") سامنے آگئے۔ اُس کے بعد ۱۹۸۱ء میں آئی بی ایم کے ڈیسک ٹاپ، ۱۹۸۴ء میں ایپل میک انٹوش (Apple Macintosh) اور ۱۹۸۵ء میں مائیکروسافٹ وِنڈوز (Microsoft Windows) کے متعارف ہونے کے بعد کمپیوٹرز گھروں اور دفاتر میں دکھائی دینے لگے۔ موبائل فون، انٹرنیٹ، ای‌میل اور سی ڈی بھی ایجاد ہو چکے تھے اگرچہ اُنہوں نے ۱۹۹۰ء کے بعد عوام میں رواج پایا۔

ہتھیاروں کی دوڑ اِس تمام عرصے میں نہ صرف جاری رہی بلکہ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ اِس سلسلے میں سب سے زیادہ تباہ کن واقعہ ۱۹۸۶ء میں پیش آیا جب سوویت یونین

میں چرنوبل کے مقام پر نیوکلیئر ری ایکٹر کسی خرابی کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ ہزاروں لوگ ہلاک ہو گئے، لاکھوں افراد کو نقل مکانی کرنی پڑی اور شہر کے شہر خالی ہو گئے۔ مشرقی یورپ کے قدرتی ماحول کو نقصان پہنچا اور تابکاری کے اثرات مغربی یورپ تک جا پہنچے:

وہ فکرِ گستاخ جس نے عُریاں کِیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اُسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اُس کا آشیانہ[1]

چھٹا مرحلہ

۱۹۸۷ء سے ۲۰۰۶ء

وہ آئیڈیلز جنہیں قوموں نے اپنے ضمیر میں بے نقاب کیا تھا لیکن اُنہیں پہچاننے میں ناکام رہی تھیں، ایک ایک کر کے نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔

۱۹۸۸ء میں جنیوا میں ہونے والے بعض معاہدوں (Geneva Accords) کے ذریعے پاکستان نے رُوس کو افغانستان میں فوجی مداخلت ختم کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ واقعہ اُن اسباب میں سے ایک تھا جن کی وجہ سے ۱۹۹۱ء میں سوویت یونین ختم ہو گیا اور سرد جنگ اپنے اختتام کو پہنچی۔ وسطی اشیا اور مشرقی یورپ کے بہت سے علاقے رُوسی وفاق یا دوسری اشتراکی آمریتوں سے آزاد ہو کر خود مختار ریاستیں بن گئے۔ دوسری طرف یورپ کے تقریباً تمام ملکوں نے ایک متحدہ سیاسی اور اقتصادی وجود تشکیل دیا۔ ۱۹۹۳ء میں یورپین یونین (European Union) کے نام سے یہ متحدہ وجود فعال ہو گیا (شروع میں برطانیہ بھی اس میں شامل تھا لیکن ۲۰۲۰ء میں وہ علیحدہ ہو چکا ہے)۔

---

[1] اقبال، 'زمانہ'، بالِ جبریل، ص ۱۷۶

*

چونکہ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد امریکہ دنیا کی واحد سپر پاور بن چکا تھا اس لیے جمہوریت، انسانی حقوق اور شخصی آزادی جیسے تصوّرات پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ قبول کیے جانے لگے۔ لیکن ان کے ساتھ ساتھ دہشت گردی، مذہبی جارحیت اور قتل و غارت کی ایک نئی لہر بھی پھیلتی رہی۔

بوسنیا (۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۵ء)، چیچنیا (۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء) اور روانڈا (۱۹۹۴ء) میں نسل کُشی کی ایسی ہولناک مثالیں سامنے آئیں کہ دنیا کانپ اُٹھی۔ صرف روانڈا میں آٹھ دس لاکھ لوگ قتل ہوئے، ڈھائی لاکھ سے پانچ لاکھ کے قریب عورتوں پر جنسی تشدد ہُوا اور تقریباً بیس لاکھ افراد ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوئے۔

دُوسری طرف امریکہ نے جمہوریت اور انسانی اقدار کے نام پر مختلف ممالک پر حملے کیے جو فوجی فتوحات کے باوجود جمہوری اقدار کو صحیح معنوں میں فروغ نہ دے سکے۔ ان میں سے ۱۹۹۱ء میں عراق پر حملہ خاص طور پر مشہور ہے۔

۲۰۰۱ء میں امریکہ پر ایک ہی دن میں دہشتگردی کے تین حملے ہوئے اور نیویارک کا ورلڈ ٹریڈ سینٹر بھی تباہ کر دیا گیا۔ تقریباً تین ہزار افراد ہلاک ہوئے اور ساٹھ ارب ڈالر سے زائد کا مالی نقصان ہُوا۔ امریکی حکومت نے اِس کا الزام مسلمان دہشتگرد تنظیم القاعدہ پر عائد کر کے "دہشت کے خلاف جنگ" (War Against Terror) کا آغاز کر دیا۔

اِس سلسلے میں امریکہ اور اُس کے حلیف ممالک نے جو اقدامات کیے، اُنھوں نے عملاً اُن اقدار کو ختم کر دیا جن پر مغرب کی جدید تہذیب کی بنیاد تھی، اور جنہیں دنیا نے بڑی قربانی اور محنت کے بعد حاصل کیا تھا، مثلاً لوگوں کو دہشت گرد قرار دے کر مقدمہ چلائے بغیر ہلاک کرنے یا قید میں رکھنے اور تشدد کرنے کا رواج عام کیا گیا جس سے اِس

اصول کی نفی ہوتی تھی کہ ہر شخص کو قانون کی عدالت میں اپنا دفاع کرنے کا حق حاصل ہے اور سزا دینے کا حق صرف عدالت کے پاس ہے۔ امریکہ نے آزاد ممالک کے بعض شہریوں کو دہشت گرد قرار دے کر اُن ممالک کی اجازت کے بغیر اِغوا کیا گیا اور ریاستوں کی خود مختاری کا تصوّر مبہم ہو گیا۔ ۲۰۰۱ء میں افغانستان اور ۲۰۰۳ء میں عراق پر فوج کشی کر کے وہاں اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کی گئیں، اور ۲۰۰۶ء میں عراق کے سابق صدر صدام حسین کو پھانسی دِلوا دی گئی۔

*

جیسا کہ علامہ اقبال نے انسان کے بارے میں لکھا ہے، "جب ماحول کو تبدیل کرنے کے راستے مسدود ہو جائیں تو وہ اپنے باطن میں ایک عظیم تر دنیا تعمیر کرتا ہے جس میں وہ بے انتہا مسرّت اور وجدان کے سرچشمے دریافت کرتا ہے۔"[1] ۱۹۸۷ء سے ۲۰۰۶ء کے عرصے میں یہی ہُوا لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی اِس کا وسیلہ بنے۔

اُس زمانے میں الیکٹرانک اور کمپیوٹر سے متعلق ایجادات کے ذریعے انسان نے مجازی حقیقت یعنی ورچوئل ریئلٹی (virtual reality) کو دریافت کیا۔ ڈیسک ٹاپ کمپیوٹرز پہلے ہی متعارف کروائے جا چکے تھے لیکن ان کا استعمال محدود رہا تھا۔ ۱۹۸۷ء کے بعد نسبتاً کم قیمت نمونے سامنے آئے اور آٹھ دس برس میں یہ دنیا بھر کے لوگوں کی روزمرہ زندگی کا حصہ بن گئے۔ ۱۹۹۱ء میں ترقی یافتہ ممالک میں انٹرنیٹ اور ایمیل عوام کی دسترس میں پہنچے اور آٹھ دس برس میں دنیا کے اکثر ممالک میں عام ہو گئے۔

اس کے ساتھ ساتھ سی ڈی، ڈی وی ڈی، ڈیجیٹل آڈیو اور ویڈیو، اور گیمنگ

---

[1] Iqbal, *Reconstruction*, p.11

(gaming) کی صنعت میں بھی اہم پیش رفت ہوئی۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں موبائل فون متعارف ہونے لگے جو پہلے پہل بیحد مہنگے ہونے کی وجہ سے محدود رہے (اور پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں اونچے طبقے کی علامت سمجھے گئے)، لیکن ۲۰۰۰ء کے لگ بھگ موبائل فونز سب کی دسترس میں آنے لگے اور ۲۰۰۶ء تک ہر طبقے میں عام ہو گئے۔ دُوسری طرف مواصلاتی نظام نے نجی کمپنیوں کو بھی اپنے اپنے ٹیلی وژن چینل بنانے کے قابل کر دیا۔

اِس طرح اُس زمانے کا آغاز ہُوا جب معلومات کسی لحاظ سے بھی فاصلوں کی محتاج نہیں رہی ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ہی انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ انسان کے باطن کی دنیا اُس کی حقیقی زندگی سے زیادہ اہم ہو گئی۔ کیونکہ اب "باطن" صرف روحانی اور مابعد الطبیعاتی معاملات کا ایک نام نہیں رہ گیا۔ ورچوئل ریئلٹی کے کسی بھی حصے کو ہم اپنے باطن کے سوا اور کہیں نہیں دیکھ سکتے۔ اِس طرح انٹرنیٹ کے ذریعے ہونے والے نجی اور کاروباری رابطے سے لے کر روپے پیسے کے وہ لین دین جو "آن لائن" ہوتے ہیں، کسی نہ کسی لحاظ سے ہمارے باطن ہی میں رونما ہو رہے ہوتے ہیں۔

یہی زمانہ انسان اور قدرت کے درمیان رابطے میں بھی ایک نیا موڑ ثابت ہُوا۔ ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۳ء تک جاری رہنے والے انسانی جینوم کے منصوبے (Human Genome Project) نے انسانی ڈی این اے کی نقشہ بندی مکمل کی۔ ۱۹۹۶ء کے لگ بھگ جانوروں کی حیاتی نقل یعنی کلوننگ (cloning) کے تجربات بھی نتیجہ خیز ہو گئے۔

۱۹۹۰ء کے لگ بھگ عام لوگوں میں اِس بات کا احساس بھی بڑھنے لگا کہ بے لگام صنعتی ترقی زمین کے قدرتی ماحول کو برباد کر رہی ہے۔ اگرچہ ماہرین کافی عرصے سے اِس سلسلے میں خبردار کرتے آ رہے تھے لیکن ماحولیاتی شعور کے عام ہونے کا زمانہ اب آیا۔

اُردو میں مستنصر حسین تارڑ کی تحریریں اِس مرحلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے میں شاید عالمی ادب میں سب سے آگے تھیں۔ اُن کے یہاں حُبُ الوطنی کے مروجہ تعلق کے بجائے زمین کے ساتھ ایک ایسا تعلق سامنے آتا ہے جس میں پہاڑ، دریا اور مناظرِ قدرت بھی ذی رُوح معلوم ہونے لگتے ہیں۔ نظریات کے بجائے انسانوں کے درمیان ایک ایسا قدرتی تعلق سامنے آتا ہے جسے سمجھنے سے ہم خود بھی قاصر ہیں۔ مثلاً اُن کے ناول بہاؤ کے آغاز میں ایک پرندے کی پرواز اِس طرح بیان کی گئی ہے:

اُس نے پھر نیچے دیکھا، خشک اور ڈوبتی آنکھوں کے سامنے بے اَنت ذرے چمکے، اور پھر اُسے ہر ہر ذرّے میں اپنی شکل اور اپنا مہاندرہ دکھائی دینے لگا۔ وہاں اُتنے پرندے تھے جتنے پرندے آج تک پیدا ہوئے، جو ہیں وہ بھی، جو نہیں ہیں وہ بھی اور جو ہوں گے وہ بھی۔ سب اُس کے ہم شکل، اُس جیسے، اُس کی اُڈیک میں۔ ہمارے پاس اُتر آؤ، ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ یہ سراب تو نہیں، یہ سراب تو نہیں، اُس نے ہر پرندے سے باری باری پوچھا اور ہر پرندے نے یہی کہا کہ اِس کا جواب تمہارے پاس ہے، اِس کا جواب تمہارے پاس ہے، سو اُس نے اپنے پروں کو حرکت میں رکھا کہ اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اِس کے کہ وہ زندہ رہنا چاہتا تھا۔

سیمرغ

ساتواں مرحلہ

۲۰۰۷ء سے ۲۰۲۶ء

۲۰۰۷ء سے وہی تحریکیں زیادہ کامیاب رہی ہیں جن میں عوام نے کسی رہنما کے بغیر خود کو منظم کیا اور جو کسی پیچیدہ نظریے کے بجائے کسی بنیادی اصول پر قائم ہوئیں۔

۲۰۰۷ء میں جب پاکستان میں آئینی تقاضے پورے کیے بغیر چیف جسٹس کو معطل کیا گیا تو اُس کے خلاف چلنے والی تحریکِ وکلا شاید اِس کی پہلی مثال تھی۔ ۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۲ء تک مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ میں آمریت کے خلاف ربیع العربی (Arab Spring) یعنی بہارِ عرب کی تحریکوں میں سے اکثر میں، اور اُسی زمانے میں سرمایہ داری کے خلاف اسپین میں عوامی احتجاج (Spanish Indignados) اور امریکہ میں وال اسٹریٹ پر قبضے (Occupy Wall Street) کے دوران بھی لوگ خود ہی منظم ہوئے۔ ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء میں ہانگ کانگ میں ایک غیر پسندیدہ قانون کے خلاف احتجاج کرنے والوں نے برُوس لی کے ایک فلمی مکالمے "پانی ہو جاؤ" ("Be water") پر عمل کر کے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ ہزاروں، لاکھوں اور بعض مواقع پر دس بیس لاکھ مظاہرین کسی رہنما کے بغیر ہی ایک جسم کے اعضا کی طرح حرکت میں آتے تھے اور ریاستی اداروں کے ہر منصوبے کو ناکام بنا دیتے تھے۔

۲۰۱۸ء میں سویڈن کی پندرہ سالہ لڑکی گریٹا تھونبرگ (Greta Thunberg) نے ماحولیاتی تبدیلی (climate change) کے خلاف تنہا احتجاج شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک عالمی تحریک میں تبدیل ہو گیا جس میں دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں کو حصہ لینا

پڑا۔

دُوسری طرف ایسی تحریکیں جن کی قیادت کوئی بڑا رہنما کر رہا تھا اکثر ناکام رہی ہیں۔ ۲۰۱۴ء میں پاکستان میں عمران خان کی قیادت میں دیا جانے والا دھرنا اِس کی ایک مثال ہے۔ وال اسٹریٹ پر قبضے کی تحریک بھی، جس کا اوپر ذکر ہُوا، اُسی وقت تک زندہ رہی جب تک عوام خود اُسے منظم کر رہے تھے۔ جونہی اُس تحریک کو اپنے نمایندے منتخب کرنے کے لیے کہا گیا، وہ دم توڑنے لگی۔

اگر ہم غور کریں تو ۲۰۰۷ء کے بعد سے اگر کسی بھی جمہوری نظام رکھنے والے ملک میں ایک بڑا لیڈر اُبھرا ہے تو اُس کی وجہ سے معاشرہ بہت بری طرح تقسیم ہُوا ہے۔ امریکہ، بھارت اور پاکستان اس کی صرف چند مثالیں ہیں۔ قدآور لیڈر صرف اُن معاشروں کو متحد رکھنے میں کامیاب ہو رہے ہیں جہاں وَن پارٹی سسٹم یا کسی اور طرح کی آمریت یا بادشاہت رائج ہے، جیسے رُوس، چین، شمالی کوریا اور سعودی عرب وغیرہ۔

اِس زمانے میں کامیاب قیادت کی ایک دلچسپ مثال یوکرین کے صدر ولوڈومیر زیلینسکی (Volodymyr Zelensky) کی صورت میں سامنے آئی ہے جو ۲۰۲۲ء میں رُوس کے حملے کے بعد سے اپنے ملک کا دفاع کر رہے ہیں۔ زیلنسکی کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی سمجھی جاتی ہے کہ اُن میں کوئی ایسی بات نہیں جو یوکرین میں اُن کی جنریشن کے ہر شخص میں موجود نہ ہو۔ بعض ماہرین کے نزدیک یہی وجہ ہے کہ زیلنسکی اپنی قوم کو متحد رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اِس دوران میں دنیا کووِڈ-۱۹ (COVID-19) کی ہولناک عالمی وبا سے بھی دوچار ہو چکی ہے جس نے ۲۰۱۹ء سے ۲۰۲۳ء کے عرصے میں ساٹھ ستّر لاکھ (اور بعض اندازوں کے مطابق دو تین کروڑ) افراد کو ہلاک کر دیا۔ ۲۰۲۰ء میں اِس وبا کی وجہ سے لوگوں کے

آپس میں ملنے جلنے پر پابندی عائد کرنی پڑی تو دنیا اِس انوکھے تجربے سے بھی دوچار ہوئی کہ تعلیم، کاروبار، ملازمت، علاج معالجہ اور یہاں تک کہ ملکوں کی وزارتوں اور پارلیمنٹوں کے اجلاس بھی آن لائن کیے گئے۔

*

یہ تمام مثالیں اِس بات کا اشارہ معلوم ہوتی ہیں کہ قدرت ہم سے اُس قسم کے اتحاد کا تقاضا کر رہی ہے جس کے لیے شیخ فریدالدین عطار نے "سیمرغ" کا استعارہ پیش کیا تھا (پہلے باب کے حصے "آخری چٹان" میں اُس کا ذکر ہو چکا ہے)۔ قدرت کا یہی اِشارہ ادب، فن اور میڈیا میں اِس طرح ظاہر ہُوا ہے کہ اِس دَور میں اِن شعبوں میں کوئی بھی شخص بڑے بڑے مصنفوں، فنکاروں اور اداروں سے زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے کیونکہ سوشل میڈیا جیسے ذرائع کسی کے بھی پیغام یا ویڈیو کو اچانک وائرل کر کے اِتنا پھیلا سکتے ہیں کہ اُس کی پہنچ بڑے بڑے اشاعتی اداروں اور فلم پروڈیوسروں سے بڑھ جائے۔

یہ سب کچھ بظاہر ایک بے ہنگم شور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل اِس طرح عمومی ارادہ (general will) اپنے آپ کو ظاہر کر رہا ہے۔ اِس زمانے میں ہم نے بارہا دیکھا ہے کہ اگر کسی جرم کے خلاف سوشل میڈیا پر تمام لوگ یکزبان ہو جائیں تو حکومت کو بھی اُس جرم کے خلاف حرکت میں آنا پڑتا ہے اگرچہ وہی حکومت بیشمار دوسرے جرائم کی طرف سے آنکھیں بند کیے رہتی ہے۔

بین الاقوامی سطح پر اِسی قسم کی ایک مثال جنگِ غزّہ کے معاملے میں سامنے آئی ہے۔ اکتوبر ۲۰۲۳ء فلسطینی تنظیم حماس کے اسرائیل پر ایک حملے کے جواب میں اسرائیل نے فلسطین کے علاقے غزّہ کے خلاف شدید جارحیت کا آغاز کیا جس میں شہری آبادی،

عورتوں، بچوں اور مریضوں کو بھی نشانہ بنایا جارہا ہے۔ سوشل میڈیا کے اثر سے مغرب میں مختلف مکاتیبِ فکر جس طرح اِس موقع پر اسرائیلی جارحیت کے خلاف یکزبان ہوئے ہیں، اُس کی مثال پہلے نہیں دیکھی گئی تھی۔ یہاں تک کہ بعض مغربی ممالک کو اپنے عوام کے دباؤ کی وجہ سے اسرائیل کی حمایت ترک کرنی پڑی ہے۔

دُوسری طرف دنیا کے اکثر حکمراں اور سیاستداں وقت کے تقاضے کو سمجھنے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ریاستوں کے تمام بڑے بڑے ادارے اپنی طبعی موت کی طرف بڑھتے نظر آرہے ہیں۔ بڑی بڑی جمہوریتوں میں عدلیہ ایسی عمارت محسوس ہوتی ہے جس کی بنیادیں اب کھوکھلی ہوچکی ہیں۔ ۲۰۲۴ء میں ساٹھ ستّر ممالک میں انتخابات ہوئے اور دنیا کی تقریباً آدھی آبادی نے ووٹ ڈالے۔ زیادہ تر ممالک میں انتخابات کے نتائج نے عوام کو جمہوریت کی مروجہ صورت سے ہی بیزار کردیا ہے، اور اُن میں امریکہ جیسا ملک بھی شامل ہے جسے دنیا میں جمہوریت کا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔

*

اِن حالات میں اگر اُس سچی جمہوریت کو نافذ کرنے کی کوشش کی جائے جو عوام کے سچے اتحاد پر قائم ہوتی ہے اور جس کے خواب رُوسو، میری پارکر فولیٹ اور علامہ اقبال جیسے مفکروں نے دیکھے تھے، تو سائنس اور ٹیکنالوجی اب اِس کے سامان فراہم کرچکی ہے۔

اسمارٹ فونز، فیس بک، یوٹیوب، ٹوئیٹر (جسے اب ایکس کہتے ہیں)، واٹس ایپ اور انسٹاگرام جیسی مصنوعات اور پلیٹ فارم ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۲ء کے عرصے میں مقبول ہوئے (ٹِک ٹاک نے ۲۰۲۰ء کے لگ بھگ مقبولیت حاصل کرنا شروع کی)۔ مصنوعی ذہانت (Artificial Intelligence) نے ۲۰۱۲ء کے قریب نمایاں ترقی کی اور ۲۰۱۶ء

کے بعد سے یہ زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں لانے لگی۔

طب کے میدان میں ۲۰۱۲ء کے قریب جین (gene) میں ترمیم کرنے کی ٹیکنالوجی ایجاد کی گئی جس نے موروثی بیماریوں کے علاج سمیت بیشمار نئے امکانات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ۲۰۱۲ء سے شمسی توانائی (solar energy) کو نسبتاً سستے داموں پیدا کیا جانے لگا ہے، جو روائتی ایندھن کے مقابلے میں ماحول کے لیے کہیں زیادہ محفوظ اور مفید سمجھی جا رہی ہے۔

دُوسری طرف ہتھیاروں کی دوڑ پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ ۲۰۰۷ء کے بعد سے ڈرونز کا استعمال میدانِ جنگ میں عام ہو چکا ہے، اور ایک بٹن دبا کر ہزاروں میل دُور لوگوں کی جان لی جا سکتی ہے۔ رُوس، چین اور امریکہ نے ایسے میزائل تیار کر لیے ہیں جو آواز سے پانچ گنا زیادہ رفتار سے پرواز کرتے ہیں، اور کسی بھی دفاعی نظام کو چکمہ دے سکتے ہیں۔ ہتھیاروں میں مصنوعی ذہانت کا استعمال بھی شروع ہو چکا ہے، جہاں فیصلے اب مشینیں کرتی ہیں۔ سائبر جنگ کا میدان بھی سامنے آ چکا ہے، جہاں دشمن کی فوج پر نہیں بلکہ اُس کے اسپتالوں، بجلی گھروں اور اداروں پر حملہ کیا جاتا ہے۔

*

۲۰۰۷ء کے بعد سے انسانی تہذیب ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں وہ پہلی بار علمِ کامل (Omniscience) کا ایک ابتدائی ذائقہ چکھنے لگی ہے۔ یہ کیفیت ماضی کے کسی دَور میں نہ تھی اور نہ ہی عقلِ انسانی نے اِسے اس سے پہلے کبھی اِس شدت سے محسوس کیا تھا۔

لیکن اگر ہم تاریخ پر گہری نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی اچانک پیش رفت نہیں۔ ۱۷۴۷ء سے لے کر آج تک تاریخ کی نادیدہ قوتیں انسانیت کو مسلسل اِسی منزل کی

طرف دھکیل رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس طویل عرصے میں بڑی بڑی تباہیاں بھی انسانی حقوق اور آزادی کے فروغ کا باعث بنتی چلی گئیں، چاہے وہ نپولین کی جنگیں ہوں، نوآبادیاتی تسلط یا دو عالمی جنگیں! چونکہ علمِ کامل کا تجربہ صرف اُسی وقت ممکن تھا جب انسان خود کو آزاد محسوس کرتا اور اپنی آواز خود سنتا اِس لیے قدرت خود اِن چیزوں کی حفاظت کر رہی تھی۔

لیکن آگے چل کر حالات بدل سکتے ہیں۔ تاریخ کی ترجیحات آہستہ آہستہ نئی سمت اختیار کر سکتی ہیں تاکہ وہ انسان کو تصوّرِ خدا کے اگلے پہلو یعنی تخلیق (Creativeness) کے تجربے کی طرف لے جائیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگلا دَور کب شروع ہو گا۔ کیونکہ ہم یہ نہیں جانتے کہ آیا ہمارے موجودہ تیسرے دَور کی مدّت بھی پچھلے دونوں ادوار کی طرف پانچ سو برس ہو گی یا اُن کے مقابلے میں یہ دَور مختصر ہو گا اور چوتھا دَور ۲۰۲۶ء کے بعد کبھی بھی شروع ہو جائے گا۔

جو بھی ہو، کچھ ایسی نشانیاں ابھی سے دکھائی دینے لگی ہیں جو اگلے دَور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اگلے باب میں اُنہی پر بات ہو گی۔

*

فی الحال ہمیں صرف یہ بات ذہن میں بٹھانے کی ضرورت ہے کہ ہم جن نعمتوں کے عادی ہو چکے ہیں وہ خود بخود قائم نہیں رہیں گی، جیسے آزادی، بنیادی حقوق اور جمہوریت۔ اب تک قدرت بھی انہیں رواج دینے میں ایک کردار ادا کرتی رہی ہے لیکن اب اُن نعمتوں کو باقی رکھنے کی ذمہ داری ہمیں محسوس کرنی چاہیئے۔ ہم یہ ذمہ داری اُسی وقت نبھا سکتے ہیں جب اجتماعی خودی کو پہچانیں اور اُس عمومی ارادے (general will) کو محسوس کریں جو

آج پہلے سے کہیں زیادہ نمایاں ہو چکا ہے۔ یہ فیصلہ اب ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم اُس ارادے کے ساتھ چلتے ہیں یا نہیں:

دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد؟
سالکِ رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ![1]

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۰۴

باب ۴

فطرت کی آغوش

یہی فرزندِ آدم ہے کہ جس کے اشکِ خُونیں سے
کِیا ہے حضرتِ یزداں نے دریاؤں کو طوفانی[1]

*

علامہ اقبال کے لحاظ سے خدا کے تصوّر کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ خدا تخلیق کرتا ہے۔ اِس حوالے سے ایک اہم بات یہ ہے کہ خدا کے تخلیق کرنے کی نوعیت ہمارے تخلیق کرنے سے مختلف ہے۔ انسانی تخلیق ہمیشہ کسی موجود شے پر انحصار کرتی ہے، جیسے مواد، وقت یا توانائی۔ ایک سنگتراش پتھر سے مجسمہ تخلیق کرتا ہے لیکن پتھر اُس نے خود نہیں بنایا ہوتا۔ مگر خدائی تخلیق کی شان یہ ہے کہ جس مواد سے وہ باقی سب کو وجود دیتا ہے، اُس مواد کو بھی وہ خود ہی تخلیق کرتا ہے۔ کیونکہ کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو خدا کی بنائی ہوئی نہ ہو:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۷۹

کہ آ رہی ہے دمادم صدائے 'کُنْ فَیَکُوں'[1]

اِس لیے اقبال کہتے ہیں، "کائنات کو ایک علیحدہ حقیقت نہیں سمجھا جا سکتا جو خدا کے مقابل میں قائم ہو۔"[2] دُوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان ہمیشہ پہلے سے موجود کسی چیز کی مدد سے کوئی نئی چیز بناتا ہے لیکن خدا کے تخلیق کرنے کی شان یہ ہے کہ جہاں کچھ موجود نہیں ہوتا وہاں وہ عدم سے ایک نئی چیز وجود میں لے آتا ہے۔

اگر ہم خدا کی اِس شان کو سمجھنے کے لیے انسانی زندگی سے کوئی مثال تلاش کرنا چاہیں تو فی الحال ہمیں ناکامی ہی ہو گی۔ لیکن بعض سائنسی رجحانات اِس طرف ایک مبہم سا اشارہ ضرور کرنے لگے ہیں اور یہی اِس باب کا موضوع ہے۔

مثلاً پچھلے باب میں جانوروں کی حیاتی نقل یعنی کلوننگ (cloning) کے تجربات کا ذکر ہُوا ہے، جو ۱۹۹۶ء کے لگ بھگ نتیجہ خیز ہونے لگے۔ سائنسدانوں نے ایک بھیڑ کے جسم سے ایک عام خلیہ (cell) لیا اور اُس کے مرکز یعنی نیوکلئیس (nucleus) سے ایک نئی بھیڑ پیدا کر لی جسے ڈولی (Dolly) کا نام دیا گیا۔ ۲۰۱۰ء میں ایک بین الاقوامی سائنسی ٹیم نے کمپیوٹر پر جینیاتی کوڈ (genetic code) لکھا اور پھر اُس کو ایک خالی خلیے میں ڈال کر ایک نیا جاندار پیدا کر لیا۔ وہ کسی موجودہ مخلوق کا بچہ یا کسی فطری جاندار کی نقل نہ تھا۔ بلکہ کچھ ایسی بات تھی جیسے مصوّر کاغذ پر ایک فرضی جانور کی تصویر بنائے اور پھر وہ تصویر زندہ ہو جائے:

فطرت کو خِرد کے رُوبرو کر　　تسخیرِ مقامِ رنگ و بُو کر

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۴۴

[2] اِس مسئلے کی مکمل وضاحت اقبال کی انگریزی تصنیف Reconstruction کے تیسرے لیکچر میں موجود ہے۔

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت　　　　جو اُس سے نہ ہو سکا، وہ تُو کر![1]

ایک اور مثال کوانٹم کمپیوٹنگ (Quantum computing) ہے۔ عام کمپیوٹر صرف اُن معلومات پر کام کرتے ہیں جو پہلے سے ہمارے علم میں ہوتی ہیں۔ لیکن کوانٹم کمپیوٹر کچھ مختلف کرتے ہیں۔ یہ ایسے امکانات کے ساتھ کام کرتے ہیں جو ابھی تک حقیقت نہیں بنے۔ بعض اوقات انہی امکانات میں سے ایک نئی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ مثلاً سائنسدانوں نے اب ایسے کمپیوٹرز بنانا شروع کر دیے ہیں جو دوا کے ایسے مالیکیول (molecule) اور ایسے نئے مادّوں کی ساخت بنا سکتے ہیں جو پہلے موجود نہ رہے ہوں۔

یہ تمام تجربات ابھی بالکل ابتدائی ادوار میں ہیں لیکن اگلی کچھ صدیوں میں بات کہاں تک پہنچ سکتی ہے؟

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ صرف اگلے تین چار سو برس میں یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اپنی مرضی کے مطابق ایک فرضی انسان کا جینیاتی کوڈ لکھا جائے اور وہ سچ مچ کا انسان بن جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی مشینیں وجود میں لائی جا سکیں جو انسان ہی کی طرح اپنی ہستی کا شعور رکھتی ہوں، اچھے برے کی تمیز کر سکتی ہوں اور ایک آزاد ارادے کی حامل ہوں۔

اِسی طرح زمین کے قدرتی ماحول میں جتنی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، اُن سب کو دُور کرنا بلکہ مریخ جیسے سیارے کے قدرتی ماحول کو انسانی رہائش کے قابل بنانا بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسے جاندار تخلیق کیے جا سکیں جو ایسے سیاروں پر زندہ رہنے کے قابل ہوں جہاں فی الحال زندگی کا وجود ممکن نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مستقبل کی کوانٹم ٹیکنالوجی کی مدد سے انسان ایسے نظام تخلیق کرے جہاں وقت کی رفتار، کششِ ثقل اور مادّے کی ساخت کو اپنی مرضی سے تبدیل کیا جا سکے۔

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۸۷

*

یہ تمام اندازے سائنسدانوں نے صرف اگلی دو چار صدیوں کے بارے میں لگائے ہیں۔ بالکل سیدھے سادے انداز میں یوں سوچ لیجیے کہ آج آپ جس طرح اپنے اسمارٹ فون سے دنیا بھر کے حالات ایک پل میں معلوم کر سکتے ہیں، کسی بھی ملک میں موجود کسی شخص سے بات کر سکتے ہیں اور ویڈیو کال کر سکتے ہیں، یہ سب کچھ آج سے سو دو برس پہلے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اگر آیندہ دو تین سو برس بعد لوگوں کے ہاتھوں میں ایسے اسمارٹ فون ہوں کہ اگر کوئی بلّی پسند آجائے تو وہ اسمارٹ فون بالکل اُسی آسانی کے ساتھ اُس بلّی جیسی نئی بلّی بنا سکے جس آسانی کے ساتھ آج آپ کسی بلّی کی تصویر یا ویڈیو بناتے ہیں؟ جیسے آپ اپنی تصویر میں ترمیم کرتے ہیں، ویسے ہی اپنے جسم میں بھی حقیقی تبدیلی کر سکیں؟ جسم کے کٹے ہوئے اعضا واپس لائے جا سکیں اور نئے اعضا اُگائے جا سکیں؟

اب ذرا سوچیے کہ اگر کچھ صدیوں کے بعد لوگ اِس قسم کی زندگی گزار رہے ہوں تو اُن کے لیے خدا کے تخلیق کرنے کی نوعیت کے بارے میں وہ تمام باتیں سمجھنا کتنی آسان ہو جائیں گی جنہیں اِس باب کے آغاز میں آپ کو سمجھانے کے لیے پورے ایک دو پیراگراف لگ گئے اور مثالیں دینا پڑیں کہ ایک سنگتراش پتھر سے مجسمہ تخلیق کرتا ہے لیکن خدا کی قوّتِ تخلیق مادے، توانائی اور وقت کی قید سے آزاد ہے؟

اگر کچھ صدیوں کے بعد روزمرہ زندگی کچھ ویسی ہو گئی جیسی ہم یہاں تصوّر کر رہے ہیں تو اُس وقت خدا کے تخلیق کرنے کی نوعیت کے بارے میں یہ تمام باتیں کہنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ صرف یہی سوچنا کافی ہو گا کہ ہماری تخلیق کرنے کی صلاحیتوں کے مقابلے میں خدا کی صلاحیت لامحدود ہے اور اُس کی جلیل القدر ہستی کے شایانِ شان ہے۔

*

اِس لیے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے ہم چوتھے دَور کی طرف بڑھیں گے، اور جب اُس دَور میں داخل ہوں گے، تاریخ اُن رجحانات کو زیادہ ترقی دینے لگے گی جو ہماری زندگیوں میں اِس قسم کی تبدیلیاں لاسکیں۔ کیونکہ جیسا کہ ہم اِس کتاب میں دیکھ چکے ہیں، جدید تاریخ کے ہر دَور میں انسانیت خدا کے تصوّر کے کسی ایک مخصوص پہلو کو اپنے تجربے میں لانے کی کوشش کرتی رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک ایسے سماجی، فکری یا تکنیکی ماحول کو تشکیل دیتی رہی ہے جہاں ایک عام انسان بھی خدا کے تصوّر کے اُس مخصوص پہلو کو محدود پیمانے پر لیکن اخلاقی معنویت کے ساتھ محسوس کرسکے۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ خدا کے تصوّر کے جن پانچ پہلوؤں کو انسانی تاریخ بتدریج محسوس کرنے کی کوشش کررہی ہے، وہ بالترتیب یہ ہیں کہ (۱) خدا ہمیشہ رہنے والا ہے؛ (۲) وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے؛ (۳) وہ سب کچھ جانتا ہے؛ (۴) وہ تخلیق کرتا ہے؛ اور (۵) اُس کی ذات لامحدود ہے۔

ہم نے دیکھا ہے کہ اندازاً ۵۰۷ء سے ۱۲۵۸ء کے عرصے میں تاریخ نے ایک ایسا سماجی، فکری اور تکنیکی ماحول بنایا جہاں تصوّرِ خدا کے پہلے پہلو یعنی دوام (ہمیشہ رہنے) کو ایک محدود پیمانے پر لیکن اخلاقی معنویت کے ساتھ محسوس کیا جاسکے۔ پانچ سو برس میں جب اِنسان نے اِس تجربے کو حاصل کرلیا تو ۱۲۵۸ء کے لگ بھگ تاریخ نے اُس معاشرے کو تقریباً پوری طرح تباہ کرکے ایک نیا معاشرہ بنایا جہاں طاقت اور قدرت کو محسوس کیا جاسکے جو تصوّرِ خدا کا دُوسرا پہلو ہے۔ انسان کو اِس تجربے سے گزارنے کے بعد ۱۷۴۷ء کے لگ بھگ تاریخ نے اُس معاشرے کو بھی مٹا دیا اور تبدریج وہ معاشرہ وجود میں آیا جہاں آج ہم تصوّرِ خدا کے تیسرے پہلو کو محسوس کرنے کے قابل ہوئے ہیں یعنی خدا سب کچھ جانتا ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ دَور ابھی مزید کتنے عرصے چلے گا اور اگلا دَور کب شروع ہو گا۔ لیکن اگر تاریخ کے بارے میں ہمارا اندازہ درست ہے تو اگلا دَور جب کبھی شروع ہُوا اُس دَور کا مقصد یہی ہو گا کہ تصوّرِ خدا کے چوتھے پہلو کو، یعنی خدا کے تخلیق کرنے کی صلاحیت کو، ایک محدود پیمانے پر لیکن اخلاقی معنویت کے ساتھ محسوس کیا جا سکے۔ کیونکہ تاریخ جو ایک قدرتی طاقت ہے، کسی ارادے کے بغیر یا صرف سائنسی اور مادی ترقی کے نتیجے میں آگے نہیں بڑھتی۔ وہ ایک شعوری انتخاب کرتی ہے کہ اب انسان کو کس پہلو سے روشناس کروانا ہے۔

اِس لیے اگلے دَور میں تاریخ اُن رجحانات کو زیادہ ترقی دے گی جو تصوّرِ خدا کے چوتھے پہلو کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں گے۔ انسانی زندگی کی باقی تمام ترجیحات کو قدرت نظر انداز کر سکتی ہے، خواہ انسانوں کو وہ ترجیحات کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہوں۔ اور یہ بات خطرے سے خالی نہیں ہے۔ آیئے اُس خطرے کا جائزہ لیتے ہیں۔

*

تیسرے دَور میں، جسے ہم اِس کتاب میں علم کا دَور کہہ رہے ہیں، تاریخ نے انسانی آزادی، مساوات، جمہوریت اور بھائی چارے جیسے تصورات کو خود نافذ کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُس دَور میں انسان کو خدا کے علمِ کامل کو جزوی طور پر محسوس کرنے کا موقع دینا تھا اور یہ تجربہ ارادے کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۷۴۷ء کے بعد یہ اقدار نہ صرف پروان چڑھیں، بلکہ بعض اوقات تو قدرت نے ظلم اور استبداد کے نظاموں کے ذریعے بھی آزادی اور جمہوریت کو دنیا پر مسلط کیا۔ لیکن تخلیق کے دَور میں، یعنی چوتھے دَور میں، صورتِ حال بدل سکتی ہے۔

چوتھے دَور میں تاریخ کا مقصد یہ نہیں رہے گا کہ انسان سب کچھ جان سکے۔ بلکہ قدرت کا ارادہ یہ ہو گا کہ انسان نئ حقیقتیں تخلیق کر سکے۔ اور تخلیق کے لیے ضروری نہیں کہ انسان آزاد ہو یا انسانوں کے درمیان برابری ہو۔ یہاں فرد کی آزادی یا رائے کا احترام نہیں بلکہ قابلیت، تسلسل، اور ارادے کی طاقت درکار ہو گی۔

لہٰذا ممکن ہے کہ اگلے دَور میں تاریخ ایسے نظاموں کو بھی برداشت کرے یا شاید فروغ دے، جو ظلم، آمریت، یا ناانصافی پر مبنی ہوں، بشرطیکہ وہ ایک مخصوص قسم کی قوّتِ تخلیق کو ترقی دے سکتے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے دَور میں آزادی، جمہوریت، یا انسانی وقار کو بچانا انسان کی اپنی ذمہ داری ہو کیونکہ تاریخ اب اُن کی محافظ نہیں ہو گی۔

اگر ہم اُن میدانوں پر نظر ڈالیں جو آنے والے دَور میں سب سے زیادہ اہم ہونے والے ہیں، جیسے جینیاتی انجینئرنگ، مصنوعی ذہانت، خلائی تسخیر، یا کوانٹم کمپیوٹنگ، تو ایک بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ سب میدان ایسے نظام کا تقاضا کرتے ہیں جہاں فیصلے تیز ہوں، منصوبے طویل المدت ہوں، اور تبدیلی کو روکنے والی ہر رکاوٹ کم سے کم ہو۔

ایسے میں ہمیں دنیا کے مختلف حصوں میں کچھ رجحانات نظر آنے لگتے ہیں، جیسے چین میں جینیاتی تحقیق، مصنوعی ذہانت، اور خلائی مشن جیسے منصوبے بغیر عوامی بحث کے نافذ ہو جاتے ہیں کیونکہ وہاں فیصلہ سازی منتشر نہیں بلکہ مرکز میں ہے۔ دنیا کے بعض ترقی یافتہ ممالک میں بھی فیصلے اب منتخب نمائندے نہیں بلکہ سائنسی مشیر، ڈیٹا ماہرین اور تکنیکی ادارے کر رہے ہیں۔ بعض ملکوں کی حکومتیں اب اپنی سروسز کو خودکار کر رہی ہیں۔ کچھ مقامات پر تو معاشرتی رویوں کی نگرانی بھی اسکور سسٹمز کے ذریعے کی جا رہی ہے، جیسا کہ چین کا "سوشل کریڈٹ سسٹم"۔ کووِڈ کے بعد دنیا نے یہ بھی دیکھا کہ انسانی جسم اور صحت کے معاملات میں بھی ریاستی مداخلت کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

مریخ پر مشن بھیجنے یا زمین کے گرد شمسی توانائی کے سسٹم بنانے جیسے منصوبے بھی صرف ایسی حکومتوں کے ذریعے ہی ممکن ہے جو انتخابی دباؤ سے آزاد ہوں۔

یہ تمام رجحانات ایک ایسے مستقبل کا اشارہ دے رہے ہیں جہاں اخلاقی بحث، جمہوری عمل، یا انسانی حقوق کا تحفظ، سائنس کی رفتار کے مقابلے میں پیچھے رہ جائے گا۔ کیونکہ تاریخ کا تقاضا اب یہ نہیں رہا کہ سب کو برابر موقع ملے بلکہ یہ ہے کہ کسی بھی قیمت پر نئی حقیقتیں تخلیق کی جائیں۔

اگر اِن نکات پر غور کیا جائے تو وہ سیاسی اور سماجی نظام جو آج ہمیں ناقابلِ قبول لگتے ہیں، کل کے ''معمول'' بن سکتے ہیں۔ بدترین آمرانہ نظام قائم ہو سکتے ہیں۔ ماضی کے کسی بھی دَور سے زیادہ برے ذات پات کے نظام رواج پا سکتے ہیں۔ انصاف اور رحم وہم گمان بن سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کو اپنے ارادے پر تو کیا اپنے جسم پر بھی اختیار نہ رہے۔ ممکن ہے کہ قانونی سطح پر بھی ایسے تجربات کی اجازت دے دی جائے جنہیں ہم آج غیر انسانی سمجھتے ہیں۔

اِس قسم کے برے حالات سے بچنے کا طریقہ تاریخ کے نہیں بلکہ تعلیم کے شعبے سے تعلق رکھتا ہے۔ صرف ''اقبال سائنسز'' پر مبنی تعلیم ہی اِس بات کو ممکن بنا سکتی ہے کہ اگلے دَور میں قدرت اپنے مقاصد بھی حاصل کر لے اور انسانیت کے احترام پر مبنی ہماری وہ اقدار بھی برقرار رہیں جنہیں ہم نے موجودہ دَور میں حاصل کیا ہے۔

اِس حوالے سے بعض تجاویز کتاب کے آخری باب ''اب کیا کرنا چاہیے؟'' میں پیش کی جا رہی ہیں۔ لیکن ہم اُنہیں زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ تاریخ کے اِس سفر سے آخر قدرت کیا مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ اگلے باب کا موضوع ہے۔

باب ۵

ستاروں سے آگے

فلک کو کیا خبر یہ خاکداں کس کا نشیمن ہے
غرض انجم سے ہے کس کے شبستاں کی نگہبانی[1]

*

خدا کی ذات لامحدود ہے، اور علامہ اقبال کے لحاظ سے یہ خدا کے تصوّر کا پانچواں پہلو ہے۔ اِسے بیان کرتے ہوئے اقبال نے واضح کیا ہے کہ خدا کے لامحدود ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کو محض ایک بکھری ہوئی توانائی یا ساری کائنات کا مجموعہ سمجھ لیا جائے۔ خدا ایک ہستی ہے اور ایک مخصوص وجود رکھتا ہے۔ اُس کے لامحدود ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں لامحدود ہے۔ اقبال کے الفاظ میں، ”خدا کی لامحدود ذات کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے اندر تخلیق کی لامحدود صلاحیتیں موجود ہیں—اور یہ کائنات، جیسی ہمیں نظر آتی ہے، اُن صلاحیتوں کا صرف ایک جزوی اظہار ہے۔ ایک لفظ میں کہا جائے تو خدا کی لامحدودیت پھیلاؤ میں نہیں بلکہ گہرائی میں ہے۔“[2]

اگر ہم ایسی مثالیں تلاش کریں جہاں انسان اپنی ذات میں اِسی قسم کی لامحدودیت کو

---

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۸۰

[2] Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. 61

خدا کی نسبت ایک چھوٹے پیمانے پر محسوس کر سکے تو سب سے پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی معراج سے وابستہ روایات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ جب آنحضورؐ مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے عرش تک سفر کر کے واپس تشریف لائے تو زمینی وقت کے صرف چند لمحے گزرے تھے اور آپؐ کے کمرے کے دروازے کی زنجیر ابھی تک ہل رہی تھی:

سبق مِلا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشَرِیّت کی زد میں ہے گردُوں![1]

قرآن میں یہ بھی کہا گیا ہے، "تم سب کا پیدا کرنا اور دوبارہ اٹھایا جانا، ایک نفسِ واحد کے پیدا کرنے اور اٹھائے جانے کے مانند ہے" (سورۂ لقمان:۲۸)۔ اِس آیت میں تمام انسانوں کے درمیان جس قسم کی وحدت بیان کی گئی ہے اگر ہم اُس کا ایک ٹھوس اور حقیقی تجربہ کر سکیں تو وہ بھی کسی نہ کسی طور پر لامحدودیت کے تجربے کی ایک صورت ہو سکتی ہے۔ اقبال نے لکھا ہے کہ پرانے زمانے میں صوفیوں کے صحیح مکاتبِ فکر نے ایسے طریقے ایجاد کر لیے تھے جو اُس وقت کے مخصوص حالات میں رہنے والوں کو اِس قسم کا تجربہ کروا سکتے تھے۔[2] اگرچہ ہمارے زمانے میں یہ طریقے کارگر نہیں ہو سکتے:

تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور
تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ![3]

سائنسدان بھی بعض ایسے مفروضے پیش کر چکے ہیں جو لامحدودیت کو پھیلاؤ کے بجائے

---

[1] اقبال، بالِ جبریل، ص ۴۴

[2] Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p. v

[3] اقبال، بالِ جبریل، ص ۱۰۴

گہرائی میں محسوس کرنے کی مثال ہیں۔ لیکن ابھی تک اُن مفروضوں کے ٹھوس ثبوت نہیں ملے ہیں، جیسے خمیدگی ٔخلا (folding space) کا نظریہ۔ اس کے مطابق کائنات میں پھیلاؤ ایک وہم ہے اِس لیے فاصلے کو موڑ کر، سکیڑ کر یا تہہ کر کے ختم کیا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم زمان و مکاں (time and space) کی گہرائیوں میں کوئی راستہ بنا سکیں۔ اِس طرح ہم ایک کہکشاں سے دُوسری کہکشاں تک پھیلے ہوئے فاصلے بھی لمحوں میں طے کر سکتے ہیں کیونکہ یہ سفر ظاہری فاصلوں پر نہیں بلکہ کائنات کی اندرونی ساخت میں کیے جائیں گے۔

*

بہر حال ہماری اِس قیاس آرائی کا تعلق مستقبل کے ایک ایسے زمانے سے ہے جو نہ صرف ابھی کئی صدیاں دُور ہے بلکہ امکان ہے کہ اُس سے پہلے انسانیت ایک اور ہنگامہ خیز دَور سے بھی گزرے گی یعنی چوتھا دَور جس کی طرف پچھلے باب میں کچھ اندازے لگائے گئے۔ اِس لیے بہتر ہو گا کہ اب ہم اِس بنیادی سوال کی طرف واپس آئیں کہ اگر مستقبل کے بارے میں یہ قیاسات درست ہوں تب بھی آج اِن سے کیا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے؟

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم تیسرے یعنی موجودہ دَور اور پانچویں کے درمیان ایک ربط دیکھ سکتے ہیں۔ آج قدرت نے جس طرح ہمارے ذرائع معلومات کو وُسعت دی ہے، اُس میں بھی ہم اپنی لامحدودیت کی جھلک ضرور دیکھ سکتے ہیں۔

تاہم یہ لامحدودیت کا حقیقی تجربہ نہیں ہے۔ ہم تیسرے اور پانچویں ادوار کی مماثلت اور فرق کو اِس مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ آج ہم دنیا کے کسی بھی گوشے میں موجود شخص سے براہِ راست فون پر بات کر سکتے ہیں یا ویڈیو کال پر اُسے دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن فرض کیجیے کہ

بالکل اِسی طرح ہم خود بھی اُس جگہ پہنچ سکیں، جیسے ابھی ہم صرف آواز یا تصویر بھیجتے ہیں؟

یہ محض ایک ممکنہ مثال ہے، اور ضروری نہیں ہے کہ سچ مچ ایسا ہو جائے۔ اصل مقصد صرف تیسرے اور پانچویں دَور کی خصوصیات میں ایک مخصوص قسم کا ربط واضح کرنا ہے۔ اور وہ ربط یہ ہے کہ موجود دَور میں ہم جن باتوں کا تصوّر کرنے یا اُنہیں جاننے، دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوئے ہیں، پانچواں دَور اُنہی کو ذاتی تجربے میں لانے کا زمانہ ہو سکتا ہے۔

چنانچہ موجودہ دَور کے بعض اہم تصوّرات اگر چوتھے دَور میں گم بھی ہو گئے تو پانچویں دَور میں قدرت خود اُنہیں دوبارہ نمودار کر دے گی۔

*

پچھلے باب میں ذکر ہُوا تھا کہ موجودہ دَور میں تاریخ نے انسانی آزادی، مساوات، جمہوریت اور بھائی چارے جیسے تصورات کو خود نافذ کیا کیونکہ اِس دَور میں انسان کو علمِ کامل کو جزوی طور پر محسوس کرنے کا موقع دینا تھا اور وہ ارادے کی آزادی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ لیکن اگلے یعنی چوتھے دَور میں چونکہ تاریخ کا مقصد اِنسان کو نئی حقیقتیں تخلیق کرنے کے قابل بنانا ہو گا، جس کے لیے ضروری نہیں کہ انسان آزاد ہو یا انسانوں کے درمیان برابری ہو، اِس لیے ہو سکتا ہے کہ قدرت شاید کچھ عرصے کے لیے ایسے نظاموں کو بھی برداشت کرے، یا اُنہیں عارضی طور پر فروغ دے، جو بظاہر ظلم یا آمریت پر مبنی ہوں۔ اب ہم اِس بات میں یہ اضافہ کر سکتے ہیں کہ اگر چوتھے دَور میں ایسا ہُوا بھی تو پانچویں دَور میں وہ آمرانہ نظام زوال پذیر ہو جائیں گے اور قدرت خود ایک ایسی جمہوریت کو نافذ کروائے گی جو آج کی جمہوریت سے کہیں زیادہ سچی آزادی پر مبنی ہو گی۔

کیونکہ پانچویں دَور میں تاریخ کا مقصد اِنسان کو لامحدودیت کا تجربہ کروانا ہو گا اور وہ

سچی آزادی کے بغیر نہیں ہو سکتا:

بندگی میں گھَٹ کے رہ جاتی ہے اک جُوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی[1]

اِس لیے اب ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ چوتھا دَور بھی دردناک ثابت نہ ہو۔

یہ اِس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم قدرت کے اشاروں کو سمجھنا سیکھیں اور اپنی سیاست، معاشرت اور تعلیم کو آنے والے دَور کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔

چوتھا دَور ایک ایسے نظام کا تقاضا کرتا ہے جہاں فیصلے تیز ہوں، منصوبے طویل المدت ہوں، اور تبدیلی کو روکنے والی ہر رکاوٹ کم سے کم ہو۔ یہ تقاضے اُس قسم کی سچی جمہوریت میں بھی پورے کیے جاسکتے ہیں جیسا کہ یسا کہ رُوسو، اقبال، اور میری پارکر فولیٹ نے ایک ایسی جمہوریت کے طور پر پیش کیا تھا جو جماعتوں یا انتخابات کے بجائے اجتماعی ارادے پر قائم ہو۔

ویسے بھی تیسرے دَور کی وہ دریافت جسے پانچویں دَور میں نمایاں اور مرکزی حیثیت حاصل ہو سکتی ہے، انسان کی وہی وحدت ہے جس کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے کہ ہم سب کا پیدا کرنا اور دوبارہ اٹھایا جانا، ایک نفسِ واحد کے پیدا کرنے اور اٹھائے جانے کے مانند ہے (سورۂ لقمان کی آیت ۲۸، جس کا حوالہ اوپر دیا جاچکا ہے)۔ اِسی وحدت کا دُوسرا نام ''تمام انسانوں کی رُوح'' ہے جسے عطار نے سیمرغ کے استعارے کے ذریعے پیش کیا اور جس کے حصول کے لیے سر سید احمد خاں نے ایک عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔

اگر ہم اِس وحدت کو اپنی زندگیوں میں مرکزی اہمیت دے سکیں تو اخوّت، آزادی اور مساوات کو تاریخ کے ہر دَور میں برقرار رکھ سکتے ہیں:

حقیقتِ ازَلی ہے رقابتِ اقوام

---

[1] اقبال، 'خضرِ راہ'، بانگِ درا، ص ۲۹۳

نگاہِ پیرِ فلک میں نہ میں عزیز، نہ تُو
خودی میں ڈُوب، زمانے سے نااُمید نہ ہو
کہ اِس کا زخم ہے درپردہ اہتمامِ رفُو
رہے گا تُو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اُتر گیا جو ترے دل میں 'لَاشَرِیکَ لَہٗ'[1]

*

آخر میں ہو سکتا ہے کہ بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہو کہ یہاں آیندہ صدیوں کے بارے میں جو اندازے لگائے گئے ہیں، اُن کا اِس مقبول سوال کے ساتھ کیا تعلق ہے کہ قیامت کب آئے گی؟ جواب اِس کے سِوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب بھی خدا کی مرضی ہو، قیامت آسکتی ہے۔

یہ بالکل اِسی طرح ہے جیسے ایک بیج کے بارے میں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ کتنے عرصے میں اور کن مراحل سے گزرتے ہوئے درخت بن سکتا ہے اور پھل دینا شروع کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن مراحل کے مکمل ہونے سے پہلے ہی آندھی نہیں آ جائے گی یا قدرت کسی اور طریقے سے اُس درخت کو نہیں اُکھاڑ پھینکے گی۔ بالکل اِسی طرح یہ کتاب بھی صرف اِنسان میں چھپے ہُوئے امکانات اور تاریخ کے اب تک ظاہر ہونے والے مزاج کی روشنی میں ایک علم کی بنیاد رکھنے کی کوشش ہے۔

---

[1] اقبال، 'محراب گل افغان کے افکار'، ضربِ کلیم، ص ۱۶۷

باب ۶

اب کیا کرنا چاہیے؟

اگر مقصودِ کُل مَیں ہُوں تو مجھ سے ماورا کیا ہے
مِرے ہنگامہ ہائے نَو بہ نَو کی انتہا کیا ہے؟[1]

*

آج ۲۰۲۶ء کی دہلیز پر[2] کھڑے ہو کر اگر ہم اپنے اطراف میں دیکھیں تو ہمیں اُفق پر ایسے طوفان منڈلاتے دکھائی دیتے ہیں جو کافی عرصے سے جمع ہو رہے تھے۔ وہ دنیا جسے ہم جانتے ہیں — مستحکم جمہوریتوں، مضبوط اداروں اور بتدریج ترقی کی دنیا — آج ہماری آنکھوں کے سامنے ٹوٹ کر بکھرتی دکھائی دے رہی ہے۔

جیسا کہ ہم نے پچھلے ابواب میں دیکھا ہے، اب اِس ٹوٹ پھوٹ کی علامات سب پر واضح ہو چکی ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی جمہوریتوں میں انصاف اور حکومت کے ادارے اپنی معنویت کھو چکے ہیں، ایسی شاندار عمارتوں کی طرح جن کی بنیادیں اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہوں۔ انتخابی عمل پر عوام کا اعتماد ختم ہو رہا ہے اور اُس کی جگہ یہ احساس پروان چڑھ رہا ہے کہ صرف آمرانہ قیادت یا یک پارٹی نظام ہی معاشروں کو قائم رکھ سکتا ہے۔ دُوسری

---

[1] اقبال، ارمغانِ حجاز، ص ۲۸۰

[2] یہ کتاب جون ۲۰۲۵ء میں لکھی گئی تھی۔

طرف سامانِ جنگ خوفناک حد تک مؤثر ہو گیا ہے اور ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو گئے ہیں جہاں ہائپر سونک میزائل چند منٹ میں کہیں بھی حملہ کر سکتے ہیں، ڈرون دُور سے قتل کر سکتے ہیں اور مصنوعی ذہانت بھی شاید انسانی ہدایت کے بغیر ہی زندگی اور موت کے فیصلے کرنے لگے۔ یہ خوف بھی محسوس کیا جا رہا ہے کہ آنے والے دور میں انسانی وقار، آزادی اور حتیٰ کہ اپنے جسم پر اختیار بھی کارکردگی اور تکنیکی کنٹرول کے نام پر قربان کیے جا سکتے ہیں۔

ایک عام دیکھنے والے کو یہ سب حادثاتی طور پر واقع ہوتا دکھائی دے سکتا ہے لیکن اقبال سائنسز ہمیں دو ایسے زاویے فراہم کرتی ہے جن کے ذریعے ہم اِس بحران کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

پہلا زاویہ یہ ہے کہ یہ خطرات اچانک پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ایک درخت کے پختہ پھل ہیں جو بہت پہلے بویا گیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے باب ۳ میں دیکھا، ۱۸۸۷ء کے آس پاس دنیا کے سامنے دو راستے واضح ہوئے۔ پہلا راستہ اتفاقِ رائے اور باہمی افہام و تفہیم کا راستہ تھا جس کی نمایاں علامت میں عالمی سطح پر دولتِ مشترکہ کا خواب، برصغیر کے میدان میں سر سید احمد خاں کی تحریک اور بعض دوسرے خطوں میں دوسرے رجحانات سامنے آ رہے تھے۔ اُنہی رجحانات میں سے آج ہمارے مسائل کے حل برآمد ہو سکتے ہیں، جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے۔

دوسری طرف ٹھیک اُسی زمانے یعنی ۱۸۸۷ء کے لگ بھگ ایک منفی رجحان بھی پیدا ہو رہا تھا جو ایک انسان کی دوسرے انسان پر برتری کا رجحان تھا خواہ وہ برتری فوجی طور پر قائم کی جائے یا ذہنی طور پر ثابت کی جائے۔ اُسی رجحان نے سائنسی اور روحانی ترقی کے اُس باہمی تعلق کو ختم کر دیا جس پر انلائٹنمنٹ (Enlightenment) کے زمانے میں جدید

تہذیب کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اِس نئے رجحان نے اِس بات کی تردید کی کہ انسانی معاشرے بھی اُسی طرح قدرت کے قوانین کے تابع ہوتے ہیں جس طرح ظاہری دنیا سائنسی قوانین کی پابند ہے۔

اِس تضاد کی ایک عمدہ تشریح "ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ" کی باطنی طور پر متضاد شخصیت تھی جیسا کہ ہم نے تیسرے باب میں دیکھا ہے۔ ڈاکٹر جیکل ایک فرشتہ صفت سائنسدان جو انسانیت کے تمام دُکھ دُور کرنے کا نسخہ دریافت کرنا چاہتا ہے اور مسٹر ہائیڈ اُسی کے باطن میں چھپا ہُوا حیوان جو بدقسمتی سے اُنہی سائنسی تجربات کی بدولت باہر آجاتا ہے۔

آج ہماری تہذیب کا "مسٹر ہائیڈ" بڑا ہو گیا ہے۔ آج کی بے لگام ٹیکنالوجی اور لالچ کی سیاست علم اور روح کی اُس طویل علیحدگی کا نتیجہ ہے جو ۱۸۷۷ء کے قریب شروع ہوئی تھی اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد مزید پروان چڑھی۔ یہ پہلا زاویۂ نظر ہے جو اقبال سائنسز کی بدولت ہمیں اپنے زمانے کے خطرات کو دیکھنے کے لیے ملتا ہے۔

دُوسرا زاویہ یہ ہے کہ یہ خطرات ماضی کی غلطیوں کا نتیجہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عجیب و غریب انداز میں تاریخ کے آیندہ منصوبوں کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں۔ ہم چوتھے دَور کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ دَور کب شروع ہو گا اور ممکن ہے کہ اُس کے باقاعدہ آغاز میں ابھی بہت مدّت باقی ہو۔ لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا، یہ آنے والا دور مکمل یکجہتی، بے پناہ کارکردگی اور انسانی صلاحیت کو متحد کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تاکہ قدرت کے قوانین کو دوبارہ لکھا جا سکے۔ تاریخ چاہتی ہے کہ انسانیت ایک مؤثر طاقت بن جائے۔ اگر ہم یہ اتحاد اپنی مرضی سے حاصل نہیں کرتے تو تاریخ اِسے ہم پر زبردستی مسلط کر دے گی۔ ٹیکنالوجی کا ایک عفریت یا ایک عالمی آمریت پر مبنی نظام

اُبھرے گا جو ہمارے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے ہماری آزادی کو بھی سلب کر کے ہمیں اگلے ارتقائی مرحلے کے لیے ضروری کارکردگی پر مجبور کر دے گا۔

تاریخ میں اِس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں سے ایک تو اِسی کتاب کے دوسرے باب میں کافی تفصیل سے بیان کی جا چکی ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ پہلے دَور کے اختتام سے ذرا پہلے، ۱۱۷۰ء کے قریب، دنیا اِسی قسم کے بحران کا سامنا کر رہی تھی (دیکھیے دوسرے باب کا حصہ ''آخری چٹان'')۔ اُس وقت بھی ہر جگہ انتشار اور زوال تھا، اور تاریخ انسانی تجربے کو اگلی منزل تک لے جانے کے لیے طاقت کے اجتماع کا مطالبہ کر رہی تھی۔ اُس نازک موقع پر شیخ فرید الدین عطار اور نظامی گنجوی جیسے صاحبِ بصیرت صوفی شاعروں نے اُس اتحاد کو ہنسی خوشی حاصل کرنے کا ایک راستہ پیش کیا۔ نظامی نے دکھایا کہ محبت کے ذریعے قوّت کو متحد کیا جا سکتا ہے اور عطار نے سیمرغ کی تمثیل کے ذریعے دکھایا کہ تیس منتشر پرندے اپنی مرضی سے یکجا ہو کر بادشاہ بن سکتے ہیں۔ یہ محبت اور اتفاق رائے کے ذریعے طاقت حاصل کرنے کا نقشہ تھا۔

لیکن اِس پیغام کی غلط تشریح کی گئی۔ تھکے ہارے ذہنوں نے اسے محض شاعری یا فلسفہ سمجھ لیا اور اِس کے سیاسی پہلو کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فطرت نے انتظار نہیں کیا۔ قوّت کا اجتماع ضروری تھا اور وہ ایک انتہائی تکلیف دہ راستے سے پورا ہوا۔ چنگیز اور ہلاکو نے خدا کے عذاب کی طرح اُتر کر آگ، خون اور بربادی کے ذریعے تاریخ کا راستہ ہموار کیا۔ ''طاقت کا جال'' جو سیمرغ کی صورت میں بھی قائم ہو سکتا تھا، وہ جابر شہنشاہوں کے ذریعے تیار کروایا گیا:

اُس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

فِطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گُناہوں کو معاف[1]

آج ہم ایک دفعہ پھر ویسے ہی دوراہے پر کھڑے ہیں۔ چوتھے دور کا مطالبہ ہمارے سامنے ہے، اور تاریخ اُسے پورا کر کے رہے گی۔ اب یہ ہم پر ہے کہ اُس کے لیے ہم نئے زمانے کے چنگیز خانوں کو اپنے اوپر مسلط ہونے کا موقع دیں یا ہم سیمرغ بن کر رضاکارانہ طور پر تاریخ کا تقاضا پورا کر دیں۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، وہ تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسی مکمل یکجہتی حاصل کی جائے جو انسان کی بے پناہ صلاحیت کو متحد کر سکے تا کہ قدرت کے قوانین دوبارہ لکھے جا سکیں۔

*

اگر ہم رضاکارنہ طور پر تاریخ کے مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر بدترین قسم کی آمریت سے بچنا چاہتے ہیں، اور اپنی اپنی آزادیوں اور جمہوریتوں کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو اُس کے لیے تین اقدامات ضروری دکھائی دیتے ہیں:

ا سب سے پہلے ہمیں اجتماعی خودی کو ایک حقیقی وجود تسلیم کرنا ہو گا۔ ہمیں یہ ماننا ہو گا کہ انسانیت بھی اور قومیں بھی ایک اجتماعی ارادہ رکھتی ہیں جو تاریخ کی تشکیل کرتا ہے۔ ہمیں دکھائی دینے والی ظاہری طاقتیں، مثلاً معاشی حقائق، افواج، سیاسی ادارے وغیرہ محض اتفاقات ہیں ورنہ اصل طاقت صرف اجتماعی ارادہ ہے جو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کسی بھی ذریعے کو استعمال میں لے آتا ہے۔سرگزشتِ آدم اور حضرتِ انسان میں یہی واضح کرنے کی

[1] اقبال، 'دین و تعلیم'، ضربِ کلیم، ص ۸۵

کوشش کی گئی ہے۔

۲ اِس عقیدے کو سیاسی حقیقت میں بھی بدلنا ہو گا۔ اِس کے لیے جمہوریت کے اصل مفہوم کو سمجھنا ہو گا جو معاشرے میں اتفاقِ رائے دیکھنے کی خواہش کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمیں بالآخر رُوسو جیسے مفکروں کی یہ بات تسلیم کرنا ہو گی کہ سیاسی جماعتوں، انتخابات اور آئین جیسی چیزوں کا اصل جمہوریت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ یہ وہ خوشنما فریب ہیں جن کے ذریعے مفاد پرست طبقے نے عوام کو جمہوریت کے اصل فوائد سے محروم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جمہوری ادارے جنہیں ہم نے پوری جمہوریت سمجھ رکھا ہے، اِن کے متعلق رُوسو، جارج واشنگٹن، میری پارکر فولیٹ اور قائداعظم جیسے جمہوریت کے سچے حامیوں نے وہی رائے ظاہر کی تھی جو اقبال کے مشہور اشعار میں پیش کی گئی ہے:

اُٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
میاں نجّار بھی چھیلے گئے ساتھ
نہایت تیز ہیں یورپ کے رَندے[1]

جمہوریت کے موجودہ غلط تصوّر کو چھوڑ کر ہمیں ”نئی جمہوریت“ کی طرف بڑھنا ہو گا اور سیاسی جماعتوں کے بجائے وہ مشترکہ پلیٹ فارم قائم کرنا ہو گا

[1] اقبال، بانگِ درا، ص ۳۳۵

جیسے میری پارکر فولیٹ نے گروہی تنظیم (group organization) اور قائداعظم نے قومی تنظیم کہا تھا۔ جنوبی ایشیا کے لیے اِس کا مطلب آل انڈیا مسلم لیگ کے ورثے کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اِس کی تفصیل اِس سیریز کی ایک اور کتاب قائداعظم کے سیاسی اصول میں پیش کی جا رہی ہے۔

۳ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اِس تبدیلی کا آغاز کسی سیاسی عمل سے نہیں بلکہ ثقافتی اور تعلیمی عمل ہی سے ہو سکتا ہے۔ پرانے ذہن نئی دنیا بنانے کے قابل نہیں ہیں۔ موجودہ ذخیرۂ علوم کی جگہ اقبال سائنسز کو رواج دینا ہو گا۔ ہمیں فروغِ نور (Enlightenment) کے اُس منصوبے کو دوبارہ شروع کرنا ہو گا جسے پہلی جنگِ عظیم کے بعد مغرب میں ترک کر دیا گیا تھا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد مشرق بھی اُس سے دستبردار ہو گیا۔ اقبال سائنسز اُسی تحریک کے تسلسل کا نام ہے۔ اِس کا نصاب اِس سیریز میں زندگی کی کتاب میں پیش کیا جا رہا ہے۔

لیکن حقیقت پسندی ضروری ہے۔ نئی جمہوریت اور ایک نئے تعلیمی نظام جیسی اونچی اونچی باتیں محض خواب و خیال ہی رہ جاتی ہیں اگر وہ ایک عام انسان کی زندگی میں بالکل بنیادی اقدامات سے شروع نہ ہوں۔ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں یہ حیرت انگیز بات دیکھنے کو ملتی ہے کہ پیغمبروں نے پیچیدہ قسم کے عالمی منصوبے پیش نہیں کیے بلکہ عام طور پر اپنے پیروکاروں سے یہی کہا کہ اپنے پڑوسی کا خیال رکھو اور اُسے بھوکا مت رہنے دو۔ اور یہی ایک سادہ سا عمل دنیا کو بدل دینے والے انقلابات کی بنیاد بن گیا۔ اِسی سادہ سے عمل سے بڑی بڑی تہذیبیں پیدا ہو گئیں۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ”وہ مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اُس کا پڑوسی بھوکا سوئے۔“ قرآن شریف میں سورۂ ضحیٰ کی مثال لیجیے کہ اُس میں خدا کے رسولؐ کو اور اُن کی نسبت سے اُن کی اُمت کو ایک عظیم الشان مستقبل کی بشارت دی گئی لیکن جب اُس عظیم الشان مستقبل کی طرف بڑھنے کے لیے عملی اقدامات بتانے کا اقدام آتا ہے تو وہ سورہ اِس کے سوا اور کوئی ہدایت نہیں دیتی کہ ”یتیم پر سختی مت کرو۔ سائل کو مت جھڑکو۔ اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا ذکر کرتے رہو۔“

دنیا کے بہت سے دُوسرے مذاہب میں بھی یہی اصول ہے۔ انجیل کی ایک آیت جو خاص طور پر جدید زمانے میں بعض بڑے مفکروں کے منشوروں کا عنوان بن گئی، کچھ اِس طرح ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے لوگوں نے پوچھا، ”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ اُنہوں نے جواب دیا، ”جس کے پاس دو لبادے ہوں وہ ایک اُسے دے دے جس کے پاس ایک بھی نہیں ہے؛ اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا کرے“ (انجیلِ لوقا، باب ۳، آیات ۱۰ تا ۱)۔ انجیل کی اِنہی آیات کے ابتدائی الفاظ، ”اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“، ۱۸۶۳ء میں ایک مشہور رُوسی ناول کا عنوان بنے اور ۱۹۰۲ء میں اشتراکی رہنما لینن نے انہیں اپنے سیاسی منشور کا عنوان بنایا۔ ۱۸۸۶ء میں عظیم روسی مفکر ٹالسٹائی نے بھی ۱۸۸۶ء میں اِسی عنوان سے ایک پمفلٹ لکھا تھا، جس کے ایک نکتے کو اقبال نے ۱۹۰۴ء میں شائع ہونے والی اپنی پہلی کتاب، علمُ الاقتصاد، میں اِس طرح پیش کیا:

> [جس طرح غلامی کو کبھی انسانی معاشرے کا ایک لازمی جزو سمجھا جاتا تھا لیکن اب وہ ختم ہو چکی ہے]، اِس طرح زمانے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظمِ عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل

خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک درد مند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مِٹ جائے؟ اِس سوال کا جواب دینا علم الاقتصاد کا کام نہیں۔ کیونکہ کسی حد تک اس کے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے۔

آگے چل کر اقبال نے خود اپنا سیاسی منشور فارسی زبان میں نظم کرتے ہوئے اُس کا عنوان بھی فارسی میں یہی رکھا کہ "اب ہمیں کیا کرنا چاہیے، اے اقوامِ شرق؟" یعنی پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟

چنانچہ ہمیں دنیا کو بدلنے کی فکر کرنے سے پہلے اپنے آپ کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ہم بدل گئے تو دنیا خود بخود بدل جائے گی۔

حوالے

اقبال، علامہ سر محمد[1]۔ [**تاریخ ندارد**]۔ اَسرار و رموز۔ لاہور [**شائع کنندہ: مصنف**]

——۔ **۱۹۲۴**۔ پیامِ مشرق [**طبعِ مکرر**]۔ لاہور [**شائع کنندہ: مصنف**]

——۔ **۱۹۲۷**۔ زبورِ عجم۔ لاہور [**شائع کنندہ: مصنف**]

——۔ **۱۹۳۰**۔ بانگِ درا [**طبعِ مکرر**]۔ لاہور [**شائع کنندہ: مصنف**]

——۔ **۱۹۳۲**۔ جاویدنامہ۔ لاہور [**شائع کنندہ: مصنف**]

——۔ **۱۹۳۵**۔ بالِ جبریل۔ لاہور [**شائع کنندہ: مصنف**]

——۔ **۱۹۳۶**۔ ضربِ کلیم۔ لاہور [**شائع کنندہ: مصنف**]

——۔ **۱۹۳۸**۔ ارمغانِ حجاز۔ لاہور [**شائع کنندہ: مصنف**]

برنی، مظفر حسین برنی (مرتب)۔ ۱۹۹۳۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول۔ **دہلی: اُردو اکادمی**

——**(مرتب)**۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم۔ **دہلی: اُردو اکادمی**

Iqbal, Dr. Sir Muhammad. 1934. *The Reconstruction of Religious Thought in Islam.* London: Oxford University Press

Sherwani, Latif Ahmad; ed. 1995. *Speeches, Writings and Statements of Iqbal.* Iqbal Academy Pakistan, Lahore

---

[1] اقبال کی مختلف تصانیف پر مختلف طریقوں سے نام لکھا ہے۔ یہاں سب کو علامہ سر محمد اقبال کے تحت رکھا جارہا ہے۔

خرّم علی شفیق

اقبال سائنسز سیریز

اقبال سائنسز (Iqbal Sciences) سے مراد یہ ہے کہ تمام سماجی علوم کو نئے سرے سے اُن اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے جو علامہ اقبال نے متعین کر دیئے تھے۔ یہ زاویۂ نگاہ معروف ماہرِ اقبالیات خرم علی شفیق کی تحقیقات کا نتیجہ ہے، جسے وہ ۲۰۰۷ء سے اپنی تصانیف میں پیش کر رہے ہیں۔ اب الہجرہ سکولز ٹرسٹ کے تحت اِس نئے علم کے خلاصے کو ایک باقاعدہ سیریز کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جسے خرّم علی شفیق نے خود تصنیف کیا ہے۔

یہ کتابیں سب کے لیے ہیں کیونکہ ان میں جو تحقیقات پیش کی جا رہی ہیں اُن سے اہلِ علم بھی عام طور پر واقف نہیں ہیں۔ اِس لحاظ سے اِن کتابوں کی ضرورت طلبہ کو بھی ہے، اور ماہرین اور اساتذہ کو بھی!

الہجرہ سکولز ٹرسٹ کے تحت پیش کی جانے والی یہ سیریز نو کتابوں پر مبنی ہیں۔ ہر کتاب اپنی جگہ مکمل ہے اس لیے قارئین اپنے ذوق کے لحاظ سے اِن میں سے کسی بھی کتاب سے آغاز کر سکتے ہیں۔ چونکہ ہر کتاب میں دُوسری کسی نہ کسی کتاب کا حوالہ بھی شامل ہے اِس لیے آپ ان کتابوں کو جس ترتیب میں بھی پڑھیں گے، بہر حال وہ آپس میں مربوط ہوتی چلی جائیں گی۔

مصنف اور ناشر کی طرف سے اِن کتابوں کو جس ترتیب میں رکھا گیا ہے، وہ اگلے صفحے پر ہر کتاب کے موضوع کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے۔

اقبال سائنسز کی کتابیں

مصنف: خرم علی شفیق

ناشر: الہجرہ سکولز ٹرسٹ

زندگی کی کتاب

انسانی علوم کا خلاصہ اقبال کی نظر سے

سرگزشتِ آدم

قدیم زمانے کی تاریخ اقبال کی نظر سے

حضرتِ انسان

انسانی علوم کا خلاصہ اقبال کی نظر سے

سیمرغ

عطار کی منطق الطیر اقبال کی نظر سے

آزادی

تحریکِ پاکستان کی مختصر تاریخ

آزادی کے بعد

پاکستان کی تاریخ ۱۹۴۷ء سے ۲۰۲۶ء تک

قومی ادب

پاکستانی ادب اقبال کی نظر سے

قائداعظم کے سیاسی اصول

علمِ سیاسیات اقبال کی نظر سے

اقبال کا فلسفہ سب کے لیے

فکرِ اقبال کے نَو بنیادی اصول

حضرتِ انسان

جدید زمانے کی تاریخ اقبال کی نظر سے

خرّم علی شفیق

یہ کتاب صرف ماضی کی نہیں بلکہ مستقبل کی تاریخ بھی ہے۔ اِس میں پچھلے بارہ تیرہ سو برس کی کہانی کے ساتھ ساتھ آئندہ ایک ہزار سال کی جھلکیاں بھی شامل ہیں۔ علامہ اقبال کے منفرد نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی یہ کتاب آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دے گی۔ آپ اِسے اِس سیریز کی کتاب سرگزشتِ آدم کا دُوسرا حصہ سمجھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں لیکن اُس کے بغیر بھی یہ کتاب آپ کو اپنی جگہ مکمل ہی محسوس ہو گی۔ یہ تاریخ کی وہ تعبیر ہے جس کی ہمارے زمانے کو ضرورت ہے۔

9786277400057

الہجرہ سکولز ٹرسٹ

وقف الهجرة AL-HIJRAH

Art: Khurram Ali Shafique using AI | Design: Syed Ahsan Ali